جناب بشیر علی صدیقی کی زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت و ترقی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف رہی ہے، درس و تدریس انکا پیشہ تھا، وہ ایک فعال اور عملی شخص ہیں، بڑھاپے میں بھی انکے جوش عمل اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی ہے، ۷۱ء میں ریٹائر ہونے کے بعد سلیم بشیر اردو میڈیم اسکول، تعلیم بالغان اور اردو ٹیچرس سرٹیفکیٹ کے نصاب کی ٹریننگ کی نگرانی وغیرہ کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے جو انکی قوت عمل اور ذوق علم و تعلیم کا ثبوت ہے، انکو شروع ہی سے تحریر و تالیف کا ذوق تھا، معلمی کے دور میں بھی انکا تحریری سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا اور یہ اب بھی جاری ہے، انکی تصنیفات زیادہ ضخیم نہ ہونے کے باوجود بقامت کہتر و بقیمت بہتر ہوتی ہیں، پہلی کتاب میں اپنی طویل تعلیمی زندگی کی سرگذشت تحریر کی ہے، اس میں انھوں نے شعبۂ تعلیم سے اپنی اولین وابستگی کے وقت سے سبکدوش ہونے تک کے تمام حالات و واقعات، اشغال، معمولات اور تجربات قلمبند کئے ہیں، اسلئے اسکی حیثیت آپ بیتی کی ہو گئی ہے، انکی تعلیمی زندگی کا آغاز گورنمنٹ انٹر کالج میں معلم کی حیثیت سے ہوا تھا، پھر وہ نارمل اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور آخر میں گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے، انکی ملازمت کی زندگی مختلف اسکولوں اور مختلف جگہوں میں بسر ہوئی، اس دوران میں طلبہ، اساتذہ، پرنسپل اور انسپکٹر کے علاوہ مختلف قسم کے اشخاص و افراد سے ان کا سابقہ رہا، تدریسی کاموں کے علاوہ طلبہ کے تحریری و تقریری مقابلے اور سالانہ مشاعرے کرائے، کالج میگزین کی نگرانی کی، علاقائی اور ڈسٹرکٹ ریلی وغیرہ اسکولی زندگی کی مختلف سرگرمیوں میں پیش پیش رہے، اس کتاب میں ان سب کا بے تکلفی کے ساتھ دلچسپ انداز میں ذکر ہے، اس سے گذشتہ نصف صدی کے ابتدائی و ثانوی تعلیم و تدریس کے شعبہ کے اتار چڑھاؤ اور مصنف کے درسی و تعلیمی تجربات وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری اور تیسری کتاب مرتب کے ساٹھ سے زیادہ معاصرین اور احباب کے خطوط کا مجموعہ ہے، جن خطوط میں کسی استفسار کا ذکر ہے انکا جواب بھی دیدیا ہے، اور ہر خط کا پس منظر اور اسکے مندرجات کی وضاحت بھی کر دی ہے، یہ تینوں کتابیں ایک تجربہ کار معلم اور اردو زبان کے شیدائی کی تصنیف ہونے کی بنا پر گوناگوں فوائد پر مشتمل ہیں، امید ہے معلمین و متعلمین کے حلقہ میں ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ جمادی الثانی ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

بابُ التقریظ والانتقاد

شذرات

معارف کے گذشتہ شذرات میں چودہ سو سال ہجری کے اندر مسلمانوں کی تاریخ کے کچھ ایسے المناک پہلو پیش کیے گئے جن سے ہمارے بعض ناظرین کو دکھ پہونچا ہوگا، اب آیندہ چند اشاعتوں میں مسلمانوں نے فرماں روائی، جہانبانی اور جہانداری کے جو عملی نمونے پیش کیے اُن کا بھی جائزہ لینا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے بیعت لینے والوں سے مخاطب ہو کر انتہائی انکسار سے فرمایا: "لوگو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں، حالانکہ میں تمھاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری اطاعت کرو، اگر برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کرو، ان شاء اللہ تمھارا ضعیف فرد بھی میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق واپس دلا دوں اور ان شاء اللہ تمھارا قوی فرد بھی میرے نزدیک ضعیف ہے یہاں تک کہ اس سے دوسرے کا حق حاصل نہ کر دوں، جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے اس کو خدا ذلیل و خوار کر دیتا ہے اور جس قوم میں بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اس کو عام مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرو، اور اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔" آپ اپنے حکام کا انتخاب کرتے وقت یہ نصیحت فرماتے کہ بندگانِ خدا کی خیر خواہی بہترین تقویٰ ہے، تم خدا کی راہ پر ہو جس میں افراط و تفریط اور ایسی چیزوں سے غفلت کی گنجائش نہیں جس میں مذہب کے استحکام اور خلافت کی حفاظت مضمر ہے، اس لیے سستی اور تغافل کو راہ نہ دو۔

حضرت عمر فاروق ؓ نے خلافت کی خدمات انجام دینے میں اپنی حیثیت ایک متولی اور شیرازہ بند کی رکھی تھی، لوگوں سے کہتے کہ تمھارے مال میں مجھ کو اسی قدر حق ہے جس قدر ایک یتیم کے مال میں متولی کا ہوتا ہے، تم کو حق ہے کہ مجھ سے مواخذہ کرو کہ ملک کا خراج بے جا طور سے نہ جمع اور نہ صرف کیا جائے، میرا یہ فرض ہے کہ تمھارا روزینہ بڑھاؤں،

سرحد کی حفاظت کروں، اور تم کو خطروں میں نہ ڈالوں، آپ اپنے عمال کو مقرر کرتے وقت ہدایت دیتے کہ وہ اپنے حدود سے آگے نہ بڑھیں، باریک کپڑے نہ پہنیں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازے پر دربان نہ رکھیں، اہل حاجت کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رکھیں، عیاض بن غنم عامل مصر کو بیش قیمت لباس پہننے اور محل بنانے کی شکایت پر کمل کا کرتہ پہنوا کر ان سے بکریاں چروائیں، حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے اپنے لیے محل بنوایا جس میں ڈیوڑھی تھی، تو آپ نے اس ڈیوڑھی میں آگ لگوا دی۔

حضرت عمر ؓ کے ایوانِ عدالت میں شاہ و گدا، ادنیٰ و اعلیٰ، خویش و بیگانہ اور مسلم و غیر مسلم سب برابر تھے اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو آپ اس سے قصاص لیتے تھے، غیر مسلموں کا علاقہ فتح ہوتا تو اعلان فرماتے کہ ان کے مذہب و شریعت اور جان و مال کو امان ہے، رعایا کی خبر گیری کے لیے راتوں کو گلیوں میں گھوم پھر کر حالات کا پتہ چلاتے، پھر دور دراز ملکوں کا دورہ بھی کرتے رہتے، آپ کی خلافت کے زمانہ میں سونے چاندی کی گنگا بہنے لگی تھی، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُرعسرت زندگی کی یاد میں نہ اچھا کھاتے اور نہ اچھا پہنتے، بدن پر پیوند لگا ہوا کرتہ، سر پر پھٹا ہوا عمامہ، پاؤں میں بوسیدہ چپل ہوتی، اسی حالت میں بیوہ عورتوں کے گھروں میں پانی بھرنے کے لیے کاندھے پر مشک اٹھا لیتے، کام سے تھک کر مسجد کے گوشہ میں فرشِ خاک پر سو جاتے، مزاج میں سختی تھی جو صرف حق پرستی کی خاطر تھی، فرمایا کرتے کہ میرا دل خدا کے بارہ میں جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا ہے، مگر اسی کے لیے پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

بیت المال کی رقم کو بڑی احتیاط سے صرف ہونے دیتے، ایک دفعہ بیمار پڑے، علاج میں شہد تجویز کیا گیا، جو بیت المال میں موجود تھا، مسجد نبوی میں جا کر لوگوں سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو تھوڑا سا شہد لے لوں گویا بیت المال پر خلیفۂ وقت کو اپنا اختیار کچھ بھی نہیں تھا، ایک بار آپ کی زوجہ ام کلثوم ؓ نے قیصر روم کے پاس تحفہ میں عطر کی چند شیشیاں بھیجیں، جس نے اس کے جواب میں شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر بھیجا، آپ کو معلوم ہوا تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ گو عطر تمھارا تھا، لیکن اس کو لے جانے والا قاصد

سرکاری تھا، اس کے مصارف عام آمدنی سے ادا کیے گئے، وہ جواہرات لے کر بیت المال میں داخل کر دیئے اور ان کو کچھ معاوضہ دے دیا، ملک میں جتنے اپاہج، از کار رفتہ اور مفلوج لوگ تھے، ان کی خوراک بیت المال سے دلاتے۔

حضرت عثمانؓ عرب کے متمول ترین لوگوں میں تھے، مگر دوسرے تیسرے دن عموماً روزے رکھتے، کبھی کبھی مہینوں روزے سے رہتے، اور رات کو صرف اسی قدر کھاتے کہ سدِ رمق کے لیے کافی ہو، گھر میں لونڈیوں اور غلاموں کی کثرت تھی، لیکن تہجد کے وقت کسی کو بیدار کرنے کی تکلیف نہ دیتے، ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے، کبھی کبھی اچھے کپڑے بھی پہن لیتے، مگر اس کا خیال رکھتے کہ اچھا لباس پہن کر عُجب و غرور پیدا نہ ہونے پائے، اپنے زمانۂ خلافت میں ذاتی مصارف کے لیے بیت المال سے ایک حبہ بھی نہیں لیا، دن کے وقت مہماتِ خلافت میں مصروف رہتے، رات کا اکثر حصہ عبادت میں گذارتے اور کبھی ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے، آپ میں سیر چشمی اور حسن سلوک کے اوصاف اتنے تھے کہ آپ کے مخالفوں کو آپ کے خلاف غلط واقعات مشہور کرنے کا موقع ملا۔

حضرت علیؓ حضرت عمرؓ ہی کی طرح عمال کی نگرانی میں سخت تھے، اصطخر کے والی منذر بن جارود کے متعلق آپ کو معلوم ہوا کہ وہ زیادہ وقت سیر و شکار میں صرف کرتے ہیں اور فرائض منصبی میں غفلت برتتے ہیں، تو ان کو لکھ بھیجا کہ تمہارے گھر کا جاہل بھی تم سے بہتر ہے، پھر انھیں معزول کر دیا، اپنی اور اپنے متعلقین کی ذات پر بیت المال کی معمولی چیز بھی صرف نہ ہونے دیتے، ایک بار آپ کی صاحبزادی ام کلثومؓ کو عمرو بن سلمہ نے ایک پیپا شہد اور ایک پیپا چربی بھیج دی، حضرت علیؓ کو معلوم ہوا تو دونوں پیپے واپس منگوا لیے، ان میں سے جو کچھ خرچ ہو چکا تھا، اس کا اندازہ لگا کر اس کی قیمت ادا کر دی، خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود فرماتے کہ دنیا مردار ہے، جو اسے حاصل کرنا چاہے اس کو کتوں کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے حضرت امام حسنؓ سے بیعت کی، مگر کچھ مہینوں کے بعد

ان کو محسوس ہوا کہ ان کی خلافت متنازعہ فیہ بن جائے گی، تو مسلمانوں کا خون خرابہ روکنے کی خاطر خلافت کو خیرباد کہہ کر مدینہ میں عزلت نشینی اختیار فرمائی، اگر حضرت امام حسنؓ کے اس اسوہ کی پیروی مسلمانوں کا حکمران طبقہ برابر کرتا رہتا تو ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

امیر معاویہؓ کا جو اختلاف حضرت علیؓ سے ہوا اس سے ان کی ذات متنازعہ فیہ ضرور بن گئی، لیکن انھوں نے اپنے غیر معمولی اوصاف کی وجہ سے جس طرح حکمرانی کے فرائض ادا کیے اسکی بنا پر وہ بنو امیہ میں سب سے بڑے مدبر اور بیدار مغز فرماں روا سمجھے جاتے ہیں، ان کے طرز حکومت کا اصول ان ہی کے قول کے مطابق یہ تھا کہ جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، اور جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر بھی رشتہ قائم ہو تو میں اس کو توڑنا پسند نہیں کرتا، لوگوں نے پوچھا: یہ کس طرح؟ تو جواب دیا کہ لوگ اس کو کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں، اور جب کسی آدمی کی کوئی بات ناگوار معلوم ہوتی ہے تو اس کی زبان انعام و اکرام سے بند کر دیتا ہوں، وہ سختی سے ضرور کام لیتے، مگر ان میں حلم کا پہلو غالب تھا، کہتے کہ غصہ پی جانے سے زیادہ میرے لیے کوئی اور شے پسندیدہ نہیں، ایک موقع پر فرمایا کہ خدا ابوبکرؓ پر رحم کرے نہ انھوں نے دنیا کو چاہا، نہ دنیا نے انھیں چاہا، عمرؓ کو دنیا نے چاہا، لیکن انھوں نے دنیا کو نہیں چاہا، عثمانؓ کو دنیا میں مبتلا ہونا پڑا، پھر اس کا اعتراف کر کے نادم ہوتے کہ ہم لوگ تو دنیا میں مبتلا ہو گئے، مگر پھر کہا: خدا کی قسم یہ حکومت بھی خدا ہی نے مجھ کو دی ہے، ایک دوسرے موقع پر کہا: خدا کی قسم اگر میرے سامنے خدا اور اس کے ماسوا کا سوال آتا ہے تو میں خدا ہی کو اختیار کرتا ہوں۔

امیر معاویہؓ کے جانشین یزید اول کے زمانہ میں کربلا کا سانحہ پیش آیا، اس کی وفات کے بعد اس کے نوجوان لڑکے معاویہ کو حکومت دی گئی، جو ۲۱ اکیس سال کا ہونے کے باوجود بڑا دیندار اور صالح تھا، اس کے باپ کے زمانہ میں جو المناک واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان سے اس کا دل حکومت سے پھر گیا تھا، اس لیے

تین مہینے کے بعد ہی مسلمانوں سے یہ کہکر حکومت سے دستبردار ہوگیا کہ تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بناؤ۔

بنو امیہ کے حکمرانوں میں عبدالملک بن مروان کا شمار مدینہ کے ممتاز فقہاء میں تھا، اس عہد کے اکابر علماء و ائمہ اس کے علمی کمالات کے معترف تھے، وہ اپنے اہم فرامین اور مراسلات کے سرنامہ پر قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ لکھتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کرتا، اپنے سکہ پر بھی قُلْ هُوَ اللّٰهُ اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نقش کرایا تھا۔

ولید بن عبدالملک کے اعلیٰ اوصاف جہانبانی کی بدولت اس کا دور فتوحات کی کثرت، دولت کی فراوانی اور زندگی کے ہر شعبہ میں مرفہ الحالی کی وجہ سے بنی امیہ کا عہد زریں سمجھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ وہ بڑا مذہبی بھی تھا، تین دن میں ایک قرآن مجید ختم کرتا، دوشنبہ اور پنجشنبہ کو پابندی سے روزے رکھتا، رمضان شریف میں روزہ داروں کے لیے کھانے بھجواتا، صلحاء و اخیار کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرتا، دو مرتبہ حج بھی کیا، مسجد نبویؐ اور جامع دمشق کی تعمیر اور تزئین و آرائش میں بے دریغ دولت صرف کی۔

سلیمان بن عبدالملک اپنے اوصاف کی بنا پر مفتاح الخیر یعنی بھلائی کی کنجی کہلاتا، اہل مدینہ اور قریش کے خاندان والوں کے لیے بڑے بڑے وظائف مقرر کیے، پھر اپنے آخری وقت میں اپنے بیٹے اور حقیقی بھائی کی موجودگی میں لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر حضرت عمر بن العزیزؒ کو اپنا جانشین قرار دیا، جن کی وجہ سے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ ہوگئی، سلیمان کا یہ کارنامہ اس کے اور تمام کارناموں پر بھاری ہے۔

سلیمان کی تجہیز و تدفین کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو شاہی سواری پیش کی گئی تو انھوں نے فرمایا: میرا خچر میرے لیے کافی ہے، اسی کے ساتھ اس فکر و تشویش کے بارے دب گئے کہ شرق و مغرب کا کوئی ایسا فرد نہیں جس کا ان پر حق نہ ہو، مطالبہ اور اطلاع کے بغیر اس کا ادا کرنا ان پر فرض نہ ہو، پھر لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ خدا نے جو چیز حلال اور حرام کردی وہ قیامت تک کے لیے حلال اور حرام ہے،

میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں بلکہ صرف احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں، میں تمھاری ہی طرح معمولی فرد ہوں، البتہ تمھارے مقابلہ میں خدا نے زیادہ گراں بار کیا ہے،

ان کا سب سے پہلا کام یہ ہوا کہ شاہی خاندان کے ارکان اور دوسرے عمائد نے جو غاصبانہ طور پر جاگیریں بنائی تھیں، ان کی اسناد کا خریطہ منگایا انھیں قینچی سے کاٹ کاٹ کر پھینک دیا، اپنی اور اپنے پورے خاندان کی ایک ایک جاگیر بھی واپس کردی، ان کی بیوی فاطمہ کو ان کے باپ عبدالملک نے ایک بیش قیمت پتھر دیا تھا، ان سے کہا کہ اسے بیت المال میں داخل کردو یا مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاؤ، اطاعت گذار بیوی نے ان کے حکم کی تعمیل کی،

انھوں نے شاہی شکوہ و تجمل کے تمام اخراجات موقوف کردیے، ملک کے مجبور اور معذور اشخاص کے لیے وظائف مقرر کیے، نادار قرض داروں کے قرض کی ادائگی کی ایک مدت قائم کی، رعایا کے ساتھ ظلم و جور کے جتنے وسیلے تھے، سب بند کرادیے ایک والی کو لکھا کہ وسوسہ شیطانی اور حکومت کے ظلم و جور کے بعد انسان کی بقا نہیں ہوسکتی، جزیہ کی وصولی میں اتنی نرمی برتی کہ بازار کا نرخ گھٹ گیا، عمال کے نام جو فرامین بھیجے اُن سب میں احیائے شریعت اور استیصالِ بدعات کی تاکید کی، مرض الموت میں ان کے پاس صرف ایک قمیص تھی، ان کے سالے مسلمہ بن عبدالملک نے اپنی بہن سے کہا کہ لوگ عیادت کو آتے ہیں، دوسری بدل دو، وہ سن کر بولیں خدا کی قسم اس کے علاوہ دوسرا کپڑا نہیں، جو ایک جوڑا کپڑا تھا، اس پر پیوند پر پیوند لگے ہوئے تھے انکے بچے بھی اسی تنگی سے زندگی بسر کرتے رہے۔

ہشام بن عبدالملک میں امیر معاویہؓ کا حلم و تدبر اور عبدالملک کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی جمع ہوگئی تھی، اس کے زمانہ میں رومیوں کو اسلامی حدود کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اس نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا تھا کہ جب تک شہادتوں سے اس کا پورا یقین نہ ہوجائے کہ یہ اصل میں ناجائز

آمدنی کا کوئی حصہ شامل نہیں، اُس وقت تک اس کو بیت المال میں داخل نہ کیا جائے، چالیس شہادتوں کے بعد ایسی آمدنی داخل کی جاتی تھی، اس کے ایوان عدالت میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہوتے، ایک مرتبہ ایک نصرانی نے اس کے لڑکے محمد کے غلام کو کسی بات پر مارا، وہ زخمی ہوگیا، محمد کے خواجہ سرا نے اس کے بدلہ میں نصرانی کو مارا، ہشام کو معلوم ہوا تو اس نے خواجہ سرا سے باز پرس کی کہ اس کو بدلہ لینے کا کیا حق تھا، اس نے محمد کے دامن میں پناہ لی، لیکن سزا سے بچ نہ سکا، وہ اپنے لڑکوں سے نماز پابندی سے پڑھواتا، ایک مرتبہ اس کا ایک لڑکا جمعہ کی نماز میں نہ جاسکا، عذر کیا کہ سواری نہ تھی، ہشام نے کہا: کیا پا پیادہ نہیں جاسکتے تھے؟ پھر سزا کے طور پر ایک سال کے لیے اس کی سواری بند کردی، اس میں بردباری بھی بہت تھی، ایک بار ایک شخص نے اس کو رودررو سخت الفاظ کہے، اس نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اپنے امام کو برا کہنا مناسب نہیں۔

مارچ کا پورا مہینہ دہلی، اسلام آباد اور کراچی کے سفر میں گذرا، میری عدم موجودگی کی وجہ سے گذشتہ معارف کے شذرات میں طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں، مثلاً ص ۱۶۵ پہ ہرش وردھن کے بجائے ہرشن وردھن، ص ۱۶۶ پہ سیتھی کے بجائے سینتھی، ص ۱۶۷ پر چندر کے بجائے چندا، ص ۱۶۷ اور ۱۶۸ پر سیسودیہ کے بجائے سیوریہ، ص ۱۶۸ پر رہے کے بجائے رہیں کی طباعت ہوگئی ہے، اسی طرح کی اور غلطیاں ہیں جن کو معارف کے ناظرین اپنے ذوق سے تصحیح کر کے ممنون کریں۔

چودہ سو سال ہجری کے خاتمہ پر ایک بین الاقوامی سمینار دہلی اور دوسرا اسلام آباد میں ہوا، ان دونوں میں شرکت کا موقع ملا، ان کی روداد معارف کے آیندہ شماروں میں انشاءاللہ شائع ہوگی۔

مقالات

کیا مصباح الارواح کا مصنّف جمالی دہلوی تھا؟

از ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مصباح الارواح مثنوی کے طرز میں ایک کتاب ہے، جس میں حصۂ نثر بھی کافی پایا جاتا ہے، نثر میں آیات قرآنی واحادیث کی مختصر تشریح عارفانہ رنگ میں ہے، پھر ان ہی مطالب کو نظم کے پیرایہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، دراصل اس کتاب کا موضوع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس بیان میں عرفان اور طریقت کا رنگ غالب ہے، اس کتاب پر ایک مقالہ تہران یونیورسٹی کے پروفیسر ضیاء الدین سجادی نے پنجاب یونیورسٹی کے اورنٹیل کالج لاہور کے جشن صد سالہ تاسیس کے موقع پر پیش کیا تھا،[1] اس مقالہ میں اس کا مصنف جمالی دہلوی[2] بتایا گیا ہے، یہ جمالی کنبوہ صاحب سیر العارفین ہیں جن کی وفات سنہ ۹۴۲ھ میں ہوئی ہے، سجادی صاحب نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مآخذ میں یہ کتاب جمالی اردستانی متوفی بسال ۸۷۹ کی طرف منسوب کی گئی ہے، مگر ان کے نزدیک یہ انتساب غلط ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

[1] یہ مقالہ جشن نامہ" ج ۲ مشتمل خطبات ومقالات مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۷۶ء میں شامل ہے۔ ص ۲۵۵ تا ۲۶۲ [2] مقالہ میں ان کا نام شروع میں حامد بن خضر اللہ کئی بار درج ہوگیا ہے، واضح رہے کہ خضر اللہ کتابت کی غلطی ہے، فضل اللہ ہونا چاہیے۔

"اور جانب توجہ آنکہ بسیاری از ماخذ آثار او را بہ پیر جمال (صحیح جمالی) یعنی جمالی اردستانی نسبت دادہ اند از جملہ ہدایت در ریاض العارفین فتح الابواب و شرح الواصلین جمالی دہلوی را بہ نام جمالی اردستانی ذکر کردہ است"

اس سے واضح ہے کہ فتح الابواب و شرح الواصلین بھی جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں،

آگے پھر لکھتے ہیں:

"در ہر حال مصباح الارواح جمالی دہلوی کہ موضوع بحث ماست یک مثنوی[1] است کہ در حدود چہار ہزار[2] و چہار صد و پنجاہ بیت دارد و نخستین مثنوی از ہفت بخش بیان حقایق احوال المصطفی است کہ شش بخش دیگر ان بہ ترتیب۔ احکام المحبین، نہایۃ الحکمۃ، بدایۃ المحبۃ، ہدایۃ المعرفۃ، فتح الابواب و شرح الواصلین است"

اس سے واضح ہے کہ ان ساتوں تصانیف کا مصنف جمالی دہلوی ہی ہے،

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جمالی دہلوی کی یہ ساتوں کتابیں جمالی کی تصانیف کے ایک قلمی مجموعے میں ہیں، جن میں حسب ذیل کتابیں اور شامل ہیں،

مہر قلوب، قدرت نامہ، نصرت نامہ، فرصت نامہ، مرأۃ الحبیب اور شرح رباعیات بابا افضل،

اس حساب سے جمالی دہلوی کی ۱۳ تصانیف ہوتی ہیں،

اس کے بعد لکھتے ہیں

"در بعضی از ماخذ آثار دیگر نیز بہ جمالی دہلوی نسبت دادہ اند مانند مثنوی مرات المعانی و نیز کتاب سیر العارفین کہ بہ سال ۱۲۱۱ ھ ق در دہلی بہ چاپ رسید"

[1] در اصل نثر کے ذکر سے صرف نظر ہوا ہے، اس سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ اس میں نظم ہی نظم ہے، مگر ایسا نہیں، جگہ جگہ نثر کی عبارتیں آ گئی ہیں، جمالی کی اکثر تصانیف کی یہی خصوصیت ہے۔ [2] خود اردستانی کے ایک بیان میں اشعار کی تعداد پانچ ہزار بتائی گئی ہے،

و تذکرہ ای در مقامات و احوال مشایخ چشتیہ و سہروردیہ ہند دارد" (دائرۃ المعارف اسلامی)

اس بیان میں سیر العارفین کو تذکرہ سے الگ قرار دینے میں پروفیسر سجادی سے غلطی ہوئی ہے، دراصل سیر العارفین ہی تذکرہ مشائخ چشتیہ و سہروردیہ[1] ہے

پروفیسر سجادی سے بڑا سہو ہوا ہے کہ انھوں نے مندرجہ بالا ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف قرار دیدیا، حقیقت یہ ہے کہ مرأت المعانی اور سیر العارفین کے علاوہ جن کتابوں کا اوپر نام گنایا گیا ہے، وہ جمالی اردستانی[2] کی ہیں، مرات المعانی اور سیر العارفین البتہ جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں،

سجادی صاحب نے مصباح الارواح کی تصنیف ۸۶۸ھ بتائی ہے اور جمالی کی وفات ۹۴۲ ہجری لکھی ہے، اگر وہ انہی دونوں باتوں پر غور کر لیتے تو اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی، وفات کے وقت اگر جمالی کی عمر ۸۰ سال کی فرض کی جائے تو اس کی پیدائش ۸۶۲ ہجری قرار پاتی ہے، اور ۸۶۸ ہجری میں جب وہ مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہے اس کی عمر ۶ سال سے زیادہ نہیں ہوتی اور اگر ۹۰ سال کی صورت میں ۸۶۸ میں وہ ۱۶ سال کا ہوگا، جمالی کی تصانیف اس تاریخ سے کچھ پہلے کی ہیں، مثلاً

[1] اس میں ہندوستان کے حسب ذیل ۱۴ مشائخ کا تذکرہ ہے، حضرت شیخ معین الدین چشتی، شیخ بدر الدین محمود، شیخ بہاء الدین زکریا، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، شیخ فرید الدین گنج شکر، شیخ صدر الدین عارف، حضرت نظام الدین اولیا، شیخ رکن الدین ابو الفتح، حضرت نجیب الدین متوکل، شیخ حمید الدین ناگوری، حضرت جلال الدین تبریزی، شیخ نصیر الدین اودھی، سید جلال الدین مخدوم جہانیان، شیخ سماء الدین دہلوی، بعض نسخوں میں تعداد میں کچھ کمی بیشی ہے، [2] اردستان کاشان اور اصفہان کے درمیان ایک قصبہ ہے، اصفہان سے ۱۸ فرسخ اور زوارہ سے دو فرسخ دور ہے، لغت نامہ دہخدا میں جمالی اردستانی، جمالی دہلوی سے الگ قرار دیا گیا ہے۔

محبوب الصادقین کی ۸۶۶ھ اور روح القدس کی ۸۶۵ ہجری ہے، جمالی کی ان تصانیف سے واضح ہوتا ہے کہ وہ علوم ظاہری کے سارے منازل طے کر چکا تھا، اور تصوف و علوم باطنی میں نہایت بلند مرتبہ حاصل کر چکا تھا، سوچنے کی بات ہے کہ بارہ (۱۲) پندرہ (۱۵) سال کے بچے سے ان علوم میں ایسی دستگاہ کا حصول کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

ایک اور بات جو واضحاً متذکرۃ الصدر ساری کتابوں کو جمالی دہلوی کی ملک قرار دینے میں حائل ہے وہ یہ ہے کہ سیر العارفین کی روایت ہے کہ ۹۲۳ ہجری میں جمالی دہلوی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جمالی کی تاریخ پیدائش ۸۶۲ قیاس کرنے پر ۹۲۳ میں اس کی عمر ۶۱ سال اور ہجری سنہ ۸۵۲ فرض کرنے پر ۷۱ سال ہوتی ہے، ۸۰ سال کی عمر تو الد و تناسل کے اعتبار سے تقریباً ناممکن اور ۷۱ سال خلاف غیر عادی ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۸ وغیرہ سالوں میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ جمالی دہلوی کی نہیں ہو سکتیں جس کی وفات ۹۴۲ ہے،

اب میں شہادت کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، میرے سامنے [1] جمالی اردستانی کی حسب ذیل تصانیف پر مشتمل ایک قلمی مجموعہ [2] موجود ہے۔

(۱) مرآت یا گنج دقایق جس میں قصۂ اجوبہ و مجوبہ عارفانہ رنگ میں بیان ہوا ہے۔

(۲) کنز الدقایق، (۳) روح القدس، (۴) تنبیہ العارفین (۵) محبوب الصادقین،

---

[1] راقم نے ۱۹۵۰ میں جمالی دہلوی پر ایک مضمون "اردو ادب" میں شایع کیا تھا، اس میں جمالی دہلوی کو جمالی اردستانی سے الگ شاعر قرار دیا گیا ہے، اگرچہ اس وقت مواد کی قلت کی وجہ سے بحث کا انداز دوسرا ہے، آگے اس مقالے میں پرانے مضامین کا حوالہ آیا ہے، [2] کتابخانہ مسلم یونیورسٹی، فارسی نمبر ۲۹۰ ۲۰ سطری، اشعار دو کالم میں، ورق تقریباً ۲۸۰ خط نستعلیق خوب، تاریخ کتابت ندارد۔

۶۔ کتاب معلومات، ۷۔ رسالہ کشف الارواح، ۸۔ راز تصوف، ۹۔ مرآت الافراد

ان کتابوں کے مصنف جمالی اردستانی ہونے کے چند اور ثبوت ہیں۔

(۱) جمالی اپنے پیر مرتضیٰ علی اردستانی مقیم اردستان سے روایت کرتا ہے،

از پیر خود [1] قطب العارفین و سید الافراد و سلطان اولیا محب و محبوب مصطفی و مرتضی

پیر مرتضی علی اصفہانی ساکن اردستان خبر می دہم و فقیر [2] از لب و دندان حضرت سالار

محققان پیر مرتضی علی اردستانی علیہ الرحمہ شنیدم کہ فرمود حدیقہ حکیم سنائی۔ الخ

کنز الدقایق [3] میں مذکور ہے کہ جمالی نے پیر مرتضیٰ علی اردستانی سے سنا کہ ان کی والدہ نوشیروان عادل کے خاندان سے تھیں۔

پیر مرتضیٰ علی [4] اردستانی قدس اللہ روحہ العزیز ... در زمانی کہ نزدیک بود

خرقۂ مبارک بیرون کند و باین فقیر ارزانی دارد الخ

واضح ہے کہ پیر مرتضیٰ علی اردستانی جمالی اردستانی کے پیر تھے، جمالی دہلوی کے پیر کا نام شیخ [5] سماء الدین کنبوہ دہلوی ہے، ان کے ذکر سے جمالی دہلوی کا دیوان پُر ہے، سماء الدین کے نام قصیدہ موجود ہے، ان کی وفات پر دردناک مرثیہ کہا ہے، ان کے بیٹے کے مرنے پر بھی دوسرا مرثیہ لکھا ہے، سیر العارفین میں ان کے حالات قلمبند کیے ہیں، اور ان کو اور صرف ان ہی کو اپنا پیر و مرشد مانا ہے، پس جو کتابیں پیر مرتضیٰ علی اردستانی کے مرید جمالی کی ہیں، وہ جمالی اردستانی کی ہیں، جمالی دہلوی کی نہیں ہو سکتیں۔

(۲) جمالی کی تصانیف میں ان کی دوسری کتابوں کا نام برابر آتا ہے، مثلاً کشف ارواح میں ہے [6]:

---

[1] مجموعہ رسائل پیر جمالی، مسلم یونیورسٹی لائبریری فارسی ۲۹۰، کنز الدقائق وغیرہ۔ ورق ۲۶۲، [2] ورق ۲۲۴، [3] ورق ۱۷۱، [4] ورق ۱۷۶، [5] سماء الدین دہلوی پر راقم نے ایک مقالہ لکھا تھا جو "معارف" جنوری اور فروری سنہ ۱۹۵۵ء کے شماروں میں شایع ہوا تھا، [6] مجموعہ رسائل ورق ۲۲۰ ب۔ اس کے پہلے کے ابیات میں مرآت، کنز الدقائق، روح القدس، تنبیہ، محبوب، غزل، قصیدہ، مستزاد، حقایق، کشف اور مصباح کا نام آیا ہے،

جمالی شد تمام ایں کشف ارواح
جہاں روشن کن از انوار مصباح

ای اخی معنی ذٰلک من انباء الغیب نوحیہ الیک درین کتاب کشف الارواح ثمہ گفتہ شد آنچہ تعلق باہل خرابات دارد ان شاء اللہ در کتاب مصباح الارواح بسمع مشتاقان برسد، میخواستم کہ حقیقت سورہ صف و جمعہ کہ ذکر آن در کتاب محبوب گذشتہ است درین کتاب بربستم نشد، این نیز جوابت بکتاب مصباح الارواح است۔

مرآت الافراد[1] میں لکھتے ہیں۔

"اگر شرح ایں کلمات خواہی کہ نیک بدانی کتاب مصباح کہ ذکر مولود حضرت سید ولد آدم است مطالعہ کن"

مرآت الافراد[2] کے ایک نجی خط میں مصباح الارواح کے ساتھ احکام المجین اور نہایۃ الحکمۃ کا نام لیتے ہیں، یہ تینوں کتابیں پروفیسر سجادی کی فہرست میں شامل ہیں جو جمالی دہلوی کی بتائی گئی ہیں۔

"مقصود ذات اہل محبت در کتاب مصباح کہ مولود حضرت رسالت گذشتہ بتامل مطالعہ کند و این کتاب را از برای آن نمی فرستادم کہ دو کتاب دیگر در عقب این کتاب آمدہ است یکی احکام المبین نام دارد و دیگری نہایۃ الحکمۃ، می خواستم در یک جلد بنوشتم، ہنوز اندک کار تذہیب ماندہ بود، بعد از این ہر کار دان کہ آید وصول خواہد یافت"

کتاب[3] مولود حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہ پنج ہزار بیت رسید، واضحاً اس سے

[1] مجموعہ ورق ۲۶۳ [2] ورق ۲۷۰ [3] ورق ۲۷۰ ب

مراد مصباح الارواح ہے، جس کے اس نسخے میں جس کو پروفیسر سجادی نے پڑھا ساڑھے چار ہزار اشعار ہیں۔

پروفیسر سجادی کی فہرست جو جمالی دہلوی کی کتابوں کی بتائی گئی ہے، اس کی حسبِ ذیل دو کتابیں جمالی اردستانی اپنی بتلاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

شرح[1] این کلمات در کتاب فتح الابواب کہ ذکر فتح مکہ است بطلب کتاب[2] ہدایۃ المعرفہ مطالعہ کن،

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جو کتابیں مثلاً مصباح الارواح، احکام المجین، نہایۃ الحکمہ ہدایۃ المعرفہ، فتح الابواب وغیرہ جمالی کی بتاتے ہیں وہ خود بقول جمالی اردستانی اس کی اپنی ہیں۔

(۳)، جمالی دہلوی کے تین لڑکوں کا پتہ چلتا ہے، ایک بچپن میں مرگیا تھا جس کا نام حسن[3] تھا، اس کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو دیوان میں محفوظ ہے، دوسرا شیخ گدائی جس کو ابراہیم لودی، بابر، ہمایوں اور اکبر کے دور میں ایسا اعزاز نصیب ہوا، جو خاندان کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہوا تھا، تیسرا بیٹا شیخ حیاتی تھا، اس کی پیدائش ۹۲۳ھ میں ہوئی، وہ شاعری کا بڑا ذوق رکھتا تھا مسائل علمی میں بھی اس کو بڑی دستگاہ حاصل تھی[4] شیخ عبدالحق دہلوی نے اخبار الاخیار[5] میں اور عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ[6] میں شیخ کی بڑی تعریف کی ہے، لیکن جمالی اردستانی کے یہاں ان میں سے کسی کا ذکر قدرۃً نہیں ملتا، اردستانی کے کئی نجی خطوط فرزند عمید الدین معروف کے نام ہیں، ان میں اپنے اشتیاق ملاقات اور جدائی کا ذکر کرتے ہیں، بخوبی ممکن ہے کہ عمید الدین معروف

[1] ورق ۲۶۶ ب [2] ورق ۲۶۰ د [3] دیکھئے اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۵۵، نیز اردو ادب ستمبر ۱۹۵۴ء ص ۱۳۷، بعد [4] صفحہ ۲۲۸-۲۲۹ [5] ج ۱ ص ۱۰۸

ان کا لڑکا ہو، ایک خط میں اس کو فرزند جگر پرتاب سے خطاب کرتے ہیں (افراد ورق ۲۶۸ ب)
دوسری جگہ فرزند مقبول سے (۲۷۴ ب) دوسرا بیٹا غالباً خواجہ مظفر الدین ہے، بانوے
ایام کے نام خط میں اس بیٹے کو ان کے پاس بھیجنے کا ذکر ہے، بانوے ایام سے غالباً ان کی
رفیقۂ حیات مراد ہیں، انھیں لکھتا ہے کہ مظفر الدین کو میرے پاس بھیجد و، فرزند خواجہ
جمال الدین محمد طائی کے بھی خط میں خواجہ مظفر الدین کو ساتھ لانے کا ذکر موجود ہے، (ورق
۲۷۴) عمیر الدین معروف کے خط میں متعدد آدمیوں کو سلام لکھوایا ہے، ان میں سے کسی کا
تعلق جمالی دہلوی سے نہیں معلوم ہوتا، اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جمالی اردستانی کا جمالی
دہلوی سے کوئی تعلق نہیں، اور جمالی اردستانی ہی مرآت الافراد[1] کا مصنف ہے، چنانچہ اسی
کتاب میں اس نے اپنی کتابوں کے نام گنائے ہیں، جن میں بیشتر وہ ہیں، جو پروفیسر سجادی
نے جمالی دہلوی کی بتائی ہیں، پس سجادی صاحب کا ان کتابوں کے انتساب کے سلسلے کا قیاس
سراسر غلط اور بے بنیاد ہے،

(۴) جمالی دہلوی کے دیوان کے دو نسخے مکشوف ہیں، ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کے ذخیرۂ حبیب گنج میں، اس میں تقریباً ۲۱۰۰ اشعار ہیں، یہ دیوان قصائد اور ترکیب
بند و ترجیع بند، مراثی پر مشتمل ہے، دوسرا کلیات کا نسخہ ہے، جو رضا لائبریری رامپور میں
محفوظ ہے، اس میں غزلیات و قصائد، قطعات، مراثی، مثنویات ہیں، ان کے علاوہ اس کا
ایک تذکرہ سیر العارفین، اور دو مثنویاں مہر و ماہ اور مرآۃ المعانی ہیں، جمالی اردستانی
کے کلام کے متعدد نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ان سے اس کی

[1] مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانہ میں جمالی اردستانی کا جو مجموعہ رسائل ہے اس میں مرأت الافراد آخری
رسالہ ہے جو ورق ۲۲۲ سے شروع ہو کر ۲۷۵ پر ختم ہوتا ہے، یہ اہم نثری تصنیف ہے جس میں عارفانہ رنگ کے

مختلف کتابوں اور رسالوں کے نام معلوم ہوتے ہیں، کلیات جمالی کے مختلف نسخوں کے متعدد جائے
حسب ذیل ٹھہرتے ہیں:-

(۱) مصباح الارواح، پیرس[1]، کلکتہ، (۲) احکام المبین، پیرس، (۳) نہایۃ الحکمہ، پیرس،
(۴) ہدایۃ الجنۃ، پیرس، (۵) ہدایۃ المعرفہ، پیرس، (۶) فتح الابواب، مجلس، پیرس، (۷) شرح
الواصلین، پیرس، کلکتہ، (۸) مہر القلوب، پیرس، کلکتہ، (۹) قدرت نامہ پیرس، کلکتہ،
(۱۰) نصرت نامہ، پیرس کلکتہ، (۱۱) فرصت نامہ، پیرس، کلکتہ، (۱۲) مرأۃ الجیب، پیرس
(۱۳) شرح رباعیات بابا افضل کاشانی، پیرس، (۱۴) گنج دقایق یا مرأت علی گڑھ (۱۵)
کنز الدقایق، مجلس، علی گڑھ، (۱۶) شرح الکنوز نفیسی، (۱۷) روح القدس، علی گڑھ،
(۱۸) تنبیہ العارفین، مجلس، علی گڑھ، (۱۹) محبوب الصدیقین مجلس، علی گڑھ کلکتہ (۲۰) میزان
الحقایق نفیسی، (۲۱) کشف الارواح مجلس، علی گڑھ، بوڈلین، (۲۲) راز تصوف علی گڑھ
(۲۳) معلومات، مجلس، علی گڑھ، (۲۴) مرأت الافراد، مجلس علی گڑھ (۲۵) مفتاح الفقر، مجلس

(بقیہ حاشیہ ۲۵۶) چھوٹے چھوٹے رسالوں کے علاوہ متعدد نجی خطوط شامل ہیں، ان میں مصنف کی زندگی
اور شخصیت کے بارے میں کافی مواد موجود ہے، اس رسالے کا آخری حصہ رسالہ فی تنبیہ السلاطین ہے،
اس کتاب میں مثنوی کے متفرق اشعار کے علاوہ چند قصیدے شامل ہیں، دو قصیدے ۸۰ سے زیادہ
ابیات پر مشتمل ہیں، متعدد غزلیں اور چند رباعیاں بھی آگئی ہیں، بقیہ دوسری کتابوں میں سوائے
مثنوی کے اشعار کے غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کچھ نہیں ملتے، یہ سارے منظومات عارفانہ ہیں
جن میں عشق و محبت کی شورش بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، [1] اس فہرست میں ہر کتاب کے سامنے جگہ کا نام
لکھ دیا ہے، جہاں کے کتاب خانے میں وہ نسخہ موجود ہے، پیرس کے نسخے کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتب خانے
میں موجود ہے، کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی اور بوہار میں جمالی کی بعض مثنویات پائی جاتی ہیں علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے کے نسخے کا ذکر ہو چکا ہے،

(۲۶) نورٌ علی نور، مجلس، کلکتہ (۲۷) فضیلۃ العشق، کلکتہ۔ (۲۸) مشکوۃ المحبین، مجلس (۲۹) مہر افروز، مجلس، (۳۰) استقامت نامہ، مجلس، (۳۱) ناظر و منظور، مجلس (۳۲) مثنویات (کوتاہ) مجلس (۳۳) قصائد مجلس (۳۴) ترجیعات مجلس (۳۵) غزلیات مجلس (۳۶) رباعیات مجلس، پیرس (۳۷) مفردات وغیرہ مجلس (۳۸) مستزادات مجلس،

ان میں مرأت الافراد کے علاوہ سب منظوم کلام ہے، گو ان میں سوائے چند کے سب میں نثر کا خاصہ حصہ شامل ہے، جمالی اردستانی کا شیوہ یہ ہے کہ اول نثر میں کوئی موضوع اجمالاً ذکر ہوتا ہے، پھر اس کی تفصیل اشعار میں (مخصوصاً مثنوی کے طرز میں) کی جاتی ہے، جمالی کا سارا کلام عارفانہ ہے جس میں اس کے شدید عارفانہ وصوفیانہ جذبات کی ترجمانی ملتی ہے،

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردستانی کا کوئی منظوم کلام جمالی دہلوی کے کلیات میں شامل نہیں علاوہ بریں دونوں کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، جمالی اردستانی کے یہاں جو عشق کا زور اور ہیجان پایا جاتا ہے وہ کسی صوفی شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گا، جمالی دہلوی صوفی ضرور تھا، لیکن اس پر دنیاوی رنگ غالب تھا، متعدد بادشاہوں کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے ابراہیم لودی کی تعریف میں اس کے قصائد موجود ہیں، اور جب اس کی شکست بابر کے ہاتھوں ہوتی ہے تو بابر کی تعریف میں اس سے پرشکوہ نظمیں لکھتا ہے، جن میں ابراہیم لودی کی تعریض بھی ملتی ہے، اس لحاظ سے جمالی کی سیرت کی بلندی مشتبہ ہو جاتی ہے، جمالی اردستانی کے

(بقیہ حاشیہ ۲۵) نفیسی کے کتب خانے میں دو مثنویاں موجود تھیں، ان کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے، مجلس سے مراد مجلس شورائے ملی، تہران ہے، احمد ابن یوسف شیرازی نے جمالی کے کلیات کے تین نسخوں کا تعارف فہرست ج ۲ میں کرایا ہے، بوڈلین میں جو نسخہ ہے، اس کا بھی ذکر وہاں کے کتب خانے مخطوطات فارسی کی فہرست میں ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:-

در محافل مولانا محمد بن جامی به دلیر بود، ہر گفتگو کے را انکار بود، در مجلس فرصت سخن داد ۔ ص

۳ اس امر کی پوری تصدیق اس گفتگو سے ہو جاتی ہے جو مولانا جامی کے ساتھ ہوئی تھی۔

کلام میں کسی دنیاوی شخص کا ذکر تک نہیں ملتا، کسی بادشاہ کی تعریف کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اس کا کلام محبت خداؐ عشق رسول اور محبت اہل بیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، اس لحاظ سے دونوں کی الگ الگ راہیں ہیں، ایک اور اعتبار سے دونوں کے کلام میں کافی تفاوت پایا جاتا ہے، جمالی اردستانی کی منظومات دراصل قرآن اور احادیث کی عارفانہ تشریح ہیں، جن میں جگہ جگہ نثر کی عبارت بھی پائی جاتی ہے، اور اسکو اس معاملے میں اتنا غلو ہے کہ مشکل سے کوئی عبارت اس خصوصیت سے عاری ملے گی، اس لحاظ سے اگر اس کے کلام سے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا انتخاب کیا جائے تو شاید قرآن کا بیشتر حصہ اور احادیث کا معتدبہ حصہ ہمارے سامنے آجائے گا، اس خصوصیت سے جمالی دہلوی کا کلام بے گانہ ہے، اس سے بطور نتیجہ صریح کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ علوم اسلامی پر جمالی اردستانی کو جتنی قدرت حاصل تھی اور جس کا اثر اس کے کلام میں موجود ہے، اس کا شائبہ جمالی کے یہاں نہیں۔

جمالی اردستانی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ہر کتاب کے نثری حصے میں وہ اخیٔ عزیز، فرزند وغیرہ کے الفاظ سے ہر جگہ خطاب کرتا ہے، یہ اس کا اپنا مخصوص طرز ہو گیا ہے، یہ جمالی دہلوی کی خصوصیت نہ تھی۔

ایک اور بات جو دونوں کے درمیان وجہ امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ جمالی اردستانی اپنی نثری تصنیف میں قدم قدم پر اشعار سے کلام کو مزین کرتا ہے، بلکہ پوری پوری غزلیں اور قصیدے درمیان میں نقل کر دیتا ہے، اس کی مرأت الافراد میں ایک قصیدہ ۱۰۰ ابیات اور دوسرا ۸۲ اشعار پر مشتمل ہے، جمالی دہلوی کا یہ شیوۂ نگارش نہیں،

ایک اور اعتبار سے دونوں کے یہاں تفاوت پایا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جمالی اردستانی نے دیوان اور کلیات کی ترتیب میں مروجہ طریقے سے عدول کیا ہے، نظم و نثر،

قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی وغیرہ کو الگ الگ موضوع حتی الامکان نہیں بنایا گیا ہے، اکثر یہ سب ملے جلے پائے جاتے ہیں، اس کے برخلاف جمالی دہلوی نے مروجہ طریقے سے اپنا کلیات مرتب کیا ہے۔

جمالی دہلوی کی تصانیف خصوصاً سیر العارفین میں ہندوستانی فضا ہے، ہندوستانی صوفیائے ہندوستان میں مرتب کی ہوئی کتابیں مانند فوائد الفواد، خیر المجالس، طبقات ناصری وغیرہ ہیں، جمالی اردستانی کی تصانیف کی فضا خالصۃً ایرانی ہے۔

غرض ان وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک دونوں کے یہاں سوائے تخلص کے اشتراک کے اور کوئی چیز مشترک نہیں، دونوں دو الگ الگ شاعر ہیں، دونوں کا دور الگ ہے، دونوں کے کلام جدا جدا اور دونوں کا رنگ متضاد، یہ محض اپنی نظر کا قصور ہے کہ ہم دونوں میں فرق نہ کر سکے۔

پروفیسر ضیاء الدین سجادی نے جمالی اردستانی کا کلام جمالی دہلوی کی طرف منسوب کر دیا تو ان سے بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جمالی اردستانی کے وجود کے جب آپ قائل ہیں تو ان کا کلام کہاں ہے، بہر حال یہ تو ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ جمالی اردستانی کی چند ابیات بعض کتابوں میں جمالی دہلوی کی طرف منسوب ہیں۔

محمد حسین آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ جمالی ہیئت گدائی میں جامی کے پاس پہنچے تو انھوں نے جمالی کے شعر کی فرمایش کی، انھوں نے یہ شعر پڑھے،

دو سہ گز کے بوریا و پوستکے — دلکے پر زدرد دوستکے
لنگکے زیر و لنگکے بالا — نے غم دزد نے غم کالا
ایں قدر بس بود جمالی را — عاشق رند لاابالی را

اگرچہ مجھے فی الحال کوئی قدیم سند اس واقعہ کی نہیں ملی، لیکن ریاض الشعراء[1] میں جمالی دہلوی کے تحت پہلا اور تیسرا شعر منقول ہے، لیکن ان اشعار کی نسبت جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے اس لیے کہ جمالی دہلوی ہرگز رند و لاابالی نہ تھا، وہ اچھا خاصہ درباری شاعر تھا، گو تصوف و عرفان سے لگاؤ بھی تھا، ان اشعار سے شاعر کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ جمالی اردستانی پر صادق آتی ہے، وہ عاشق تھا عشق میں سرشار دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ تقی اوحدی نے عرفات[2] میں ان اشعار کو جمالی دہلوی کی ملکیت ماننے سے انکار کیا ہے، اور وہ حق بجانب ہے: تقی لکھتا ہے:

"پیر جمالی عراقی مولد و منشاء وے اردستان اصفہان است و از مریدان پیر رکن الدین علی اردستانی بودہ... صاحب سلسلہ مرید و مراد است، مریدان خود را برداشتہ پیادہ بمکہ معظمہ بے زاد و راحلہ رفتہ و سلامت بکعبۂ مراد مقصود رسید ..... اشعار بسیار گفتہ، رقص پیر جمالی بدو منسوب است، چہ بطلیعہ بذوق و سماع بودہ، باتفاق مریدان دست از ہستی و ہمی خویش کر محض پندار است بایں رقص می افشاندہ، او راست

دو گزک بوریا و پوستکی — دلکی پر ز درد و دوستکی
ایں قدر بس بود جمالی را — عاشق رند لاابالی را

بعضے ایں دو بیت را بہ جمالی دہلوی نسبت کردہ اند، غلط و سہو است"

جمالی اردستانی کے کلیات کا ایک حصہ جو راقم کے ملاحظہ میں رہا، اس میں یہ اشعار میری نظر سے نہیں گذرے، لیکن حسب ذیل ابیات میں وہ اپنے کو رند و لاابالی قرار دیتا ہے، اور اتفاق سے یہ فقرہ عیناً پہلی بیت میں پایا جاتا ہے:

---

[1] نسخۂ کتب خانہ دانش گاہ علی گڑھ، ورق ۸۰ ب [2] عرفات ج ۱ نسخہ بانکی پور پٹنہ، ورق ۱۹۱ - ۱۹۲۔

کہ ما ہشتیم رند و لاابالی — بجو از ما بجز ساقی و ساغر

این عرہ بغیر لاابالی — کس می نزد و پے جمالی

پردہ عشق جز ملامت نیست — قامتِ عشق در سلامت نیست

تا جمالی جمالِ عشق ندید — روے دل در پلاس فقر کشید

تا کہ نامحرمش نہ بیند روے — تا خورد فاش بادہ بر سر کوے

اس طرح کے اشعار کی بنا پر جامی اور جمالی دہلوی کی ملاقات کے سلسلہ میں جو افسانہ تراشا گیا ہے، وہ محض بے بنیاد ہے۔

استاد ضیاء الدین سجادی نے اپنے مقالہ کے آخر میں یہ لکھا ہے:

"دریں مقالہ اہمیت کار جمالی دہلوی دریں مثنوی و سایر آثارش نمودہ شدہ و باختصار دربارۂ آنہا گفتگوے بمیان آمدہ ولے موضوع اصلی بحث ہماں مصباح الارواح است کہ برائے نخستین بار ایں گونہ ازاں صحبت می شود۔"

اس بیان میں اتنی بات ٹھیک ہے کہ مصباح الارواح پر اب تک کسی نے الگ سے کوئی مقالہ نہیں لکھا تھا، اور موصوف نے چند صفحے (۲۵۵ تا ۲۶۲) میں جمالی دہلوی اور اس کی طرف منسوب اس مثنوی کا تعارف کرایا ہے، لیکن انھوں نے مسئلہ کو بالکل الجھا کر رکھ دیا ہے، نہ وہ جمالی اردستانی سے واقفیت حاصل کر سکے اور نہ جمالی دہلوی سے، اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اس موضوع پر جو قابل ذکر مواد بیسیوں سال قبل مشرق و مغرب میں سامنے آچکا تھا، وہ اس سے مطلقاً واقف نہ تھے، ذیل میں اس سلسلہ کی بعض کوششوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں،

---

[1] مجموعہ رسائل جمالی اردستانی. نسخہ کتب خانہ علی گڑھ، ورق ۲۳۹ [2] ورق ۱۰۹ الف

[3] ورق ۱۷۰ الف

تاکہ معلوم ہو سکے کہ تہران یونیورسٹی کے اس ایرانی پروفیسر کی تحقیق کا کیا درجہ ہے۔

اودھ کے کتب خانے میں جمالی کے کلام کے دو حصے تھے، اسپرنگر نے لکھا ہے کہ جمالی کی ایک تصنیف بیان الحقائق ہے جو سات حصوں میں منقسم تھی، پہلی مصباح الارواح اور آخری شرح الواصلین، یہی بیان الحقائق مع چند اور رسالوں کے جناب سجادی صاحب کے پیش نظر تھی، اسپرنگر بھی سجادی صاحب کی طرح جمالی اردستانی کی شخصیت سے ناواقف ہے۔

اسٹورٹ نے ٹیپو سلطان کے کتاب خانے میں مصباح الارواح کے ایک نسخے کا پتہ دیا ہے، تفصیل اس کے یہاں نہیں ملتی، آکسفورڈ کے کتب خانہ بادلیان میں جمالی کے کلام کے یہ حصے موجود ہیں:

کشف الارواح، فضیلۃ العقل، نور علی نور، قصائد و رباعیات، فہرست نگار نے انھیں جمالی دہلوی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی بیان الحقائق کے پہلے اور ساتویں حصے موجود ہیں، اور امپیریل لائبریری میں حسب ذیل پانچ مثنویاں موجود ہیں:

محبوب الصدیقین، مہر القلوب، فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، پروفیسر ایوانو نے اسپرنگر، زاخو اور ایتھے کی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے آج سے پچاسوں سال پہلے لکھ چکا ہے کہ یہ مثنویاں جمالی دہلوی کی نہیں ہیں، ان کا بیان ملاحظہ ہو:

جمالی جو ۹۰۶ھ تک تقریباً بیس[2] کتابوں کا مصنف ہو وہ ۶۰ سال بعد کیونکر اس قابل ہوگا کہ حج کی مشقت برداشت کرے اور وہاں سے واپسی پر سیر العارفین لکھے، اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سیر العارفین کا تعلق عہد ہمایوں سے نہیں (حالانکہ یہ قیاس بے بنیاد ہے) پھر بھی حسب ذیل

---

[1] اس بحث کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون "خسرو ثانی جمالی دہلوی" اردو ادب ستمبر ۱۹۵۴ء

قرائن کی وجہ سے دونوں کی شخصیت الگ الگ ثابت ہوتی ہے :

(۱) جمالی جو مذہبی مفکر تھا، اور جمالی صاحب سیر العارفین کے طرز فکر میں نمایاں فرق ہے۔

(۲) اول الذکر شیعہ معلوم ہوتا ہے، جب کہ سیر العارفین کا مصنف سنی اور صوفیہ سلاسل میں سلسلۂ چشت سے متعلق تھا۔

(۳) اول الذکر نے صرف ایرانی مشایخ کا ذکر کیا ہے، ہندوستانی مشایخ سے اس کا کلام عاری ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات یہ عرض کرنی ہے کہ ایرانامہ نے جمالی دہلوی کی وفات ۹۴۲ھ کے بجائے سہواً ۹۲۲ لکھی ہے، دراصل ۴ کا ہندسہ غلطی سے ۲ پڑھ لیا گیا ہے، دوسری بات جمالی اردستانی کا تشیع ہے، اس میں شبہہ نہیں کہ اس کا کلام اہل بیت اطہار کی مدح سے پُر ہے، وہ حضرت علیؓ اور سیدنا حسنینؑ سے بڑی عقیدت رکھتا ہے، ان حضرات کی مدح کے سیکڑوں شعر اس کے یہاں موجود ہیں، لیکن اس نے کم از کم ایک جگہ حضرت ابو بکرؓ کا ذکر ایسے الفاظ سے کیا جو شیعہ حضرات کا عمومی مسلک نہیں ہے، وہ واقعہ یہ ہے[1] :

"حق تعالیٰ کہ فرمود یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ [2] در ایں آیت اشارہ بصحابہ کرد، می فرماید کہ اے پیغمبر، خیز و نزدیکاں ما بیدار گرداں و ایشاں را بہ ایمان درآور و از غبار کفر شاں پاک گرداں کہ ایشاں چوں لباس جان تو اند و دین اسلام بمدد ایشاں قرار گیرد کہ جان بے تن قرار نہ گیرد و ازیں جہت بحکم اول صدیق ایمان آورد، و دیگر علی مرتضیٰ علیہ السلام کہ ابو بکر از مابان است و علی ابن ابی طالب از متطہرین است، قولہ تعالیٰ[3] : اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔

[1] مجموعہ رسائل جمالی، نسخہ علی گڑھ، ورق ۲۶۸ ب [2] قرآن سورہ ۷۴، آیت ۱، ۲۔

[3] قرآن سورہ ۲: ۲۲۲

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝

یعنی مگذار کہ امت گرفتار اہل شوند و بار ایشاں بر دوش خود گیر و مگذار کہ ایشاں در ناکدان دنیا بمانند و با تو سیر نکنند و اہل ایشاں را گواہ گرداں خصوصاً ہر کہ تو نزدیک است در فیق تست از بہر آں بود کہ صدیق گلیم بر دوش است و ترک دنیا کرد کہ گوش صدیق ایں بشنید وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

علاوہ بریں اردستانی سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک تھے جیسا کہ خود ان کے حسب ذیل بیان[2] سے واضح ہے :

"اوائل کتاب روح القدس در بیان روش انبیاءؑ است کہ شریعتش گویند و اوسط آں در بیان اہل طریقت و آخرش در شرح اہل حقیقت کہ ارباب عشق و محبت اند، و ایں قسم نیز اولش مشتمل بر ذکر شیخ الاسلام شیخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ کہ شیخ شریعت است در شرح ... و اوسطش بیان احوال شیخ زین الملت والدین عبد السلام کاموی قدس سرہ کہ پیر طریقت است، و آخرش مشتمل است بر بیان ظہور حضرت پیر مرتضےٰ علی اردستانی قدس اللہ روحہ العزیز کہ از ارباب تصوف و محبت و عشق و حقائق معرفت است و اہل معرفت از و سیر و سلوک و عاشقاں دانستند۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کی شخصیت اتنی معروف ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، شیخ زین الدین عبد السلام کاموی شیخ[3] کے تربیت یافتہ تھے، چنانچہ اردستانی نے

[1] قرآن، سورہ ۷۴، آیت ۳ - ۵ ؛ [2] مجموعہ رسائل جمالی اردستانی نسخہ علی گڑھ ورق ۷،۲

[3] شیخ زین الدین عبد السلام کاموی کی زندگی کا یہ نہایت اہم ماخذ ہے، کئی سال سے راقم کو شیخ کے حالات کی تلاش تھی، اتفاق سے آج جا کر اس سلسلے میں کامیابی ہوئی ہے، اردستانی نے مرآۃ الافراد میں شیخ صدر الدین اشنوی کی زندگی کا ایک اہم واقعہ درج کیا ہے، صدر الدین اپنے دور کے زبردست عالم اور فلسفی تھے، چنانچہ اپنے علم میں غلو کی وجہ سے شہر بدر بھی کر دیے گئے تھے، شاعر بھی تھے، وصاف کے معاصر تھے، چنانچہ اس نے ان کے متعلق دلچسپ اطلاع

آخر الذکر کے عرفان اور کسبِ فیوض کا ذکر متعدد جگہ کیا ہے[1]۔

از ان قطب عالم شہ سہروردی — در علم بکشود بر زین فسرد
چو شد در کمالات بے شک و طاق — فرستادہ شیخش بسوئے عراق

ضمناً ذکر ہے کہ شیخ زین الدین عبد السلام کاموی کے نام سے شیخ اسماعیل بن عبدالمومن بن ابی منصور اصفہانی نے کتاب العوارف کا ترجمہ ۶۶۵ ہجری میں کیا، اس ترجمہ کو راقم نے ایک تفصیلی مضمون کے ذریعہ روشناس کرایا ہے، اس کا ایک نسخہ مکتوبہ ۸۹۷ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

ان وجوہ سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ جمال الدین اردستانی سنی تھے، گو ان کی تفضیلیت بھی اسی طرح نمایاں ہے۔

آج سے ۲۶ سال قبل راقم نے ایک مضمون بعنوان "خسرو ثانی شیخ جمالی دہلوی" اردو ادب (جولائی تا ستمبر ۱۹۵۴) میں شایع کیا تھا، اس میں جمالی اردستانی کی منظومات کے جمالی دہلوی کی طرف انتساب کو غلط بتایا تھا، اگرچہ اس وقت میرے پیش نظر نہ جمالی اردستانی کا کلیات اور نہ جمالی دہلوی کے کلیات نسخہ رام پور تک میری رسائی تھی، پھر بھی میں اس نتیجے پہ پہونچا تھا کہ جمالی اردستانی کی تصانیف جمالی کی طرف منسوب نہیں ہوسکتیں، اس وقت میرے قیاس کی بنیاد یہ تھی، یہ بہت مشکل سے تسلیم کیا جاسکے گا کہ ۸۶۶ھ میں شیخ جمالی دہلوی صاحب تصنیف ہو سکے گا،

(بقیہ صفحہ ۲۶۵) بہم پہونچائی ہے، ان کی شاعری کا سب سے اہم ماخذ شیخ اسماعیل اصفہانی کا ترجمہ عوارف المعارف ہے، ان کے والد شیخ تاج الدین اشنہی کے بھی کافی اشعار ترجمہ عوارف میں محفوظ ہیں، اشنہ جہاں سے ان دونوں بزرگوں کا تعلق ہے، اصفہان کا ایک قریہ ہے، اسی نام کا ایک قریہ رومیہ کے جوار میں ہے، جمالی اردستانی کے بیان سے طے ہو گیا ہے کہ تاج الدین کا تعلق اصفہان والے قریے سے تھا۔ اشنہ سے اشنوی اور اشنہی دونوں نسبتیں منقول ہیں۔

[1] رسائل اردستانی، ورق ۶۳

ساتھ ہی تصوف میں اس قدر پختہ ہوجائے گا کہ اس کے اہم مسائل شعر کے ذریعہ عام کر سکے گا، جامی نے لکھا ہے کہ وہ شیخ سماء الدین سے رن تھنبور میں مرید ہوا، جب ان کی عمر ۹۵ سال سے زاید ہوگی، اگر شیخ کی عمر ۹۰-۱۰۰ سال کی سمجھ لی جائے تو چونکہ ان کا انتقال ۹۰۱ ہجری میں ہوا تو ان کی پیدائش ۸۰۱ھ یا ۸۱۱ھ میں ہوئی ہوگی، اور رن تھنبور کا قیام ۸۶۶ھ کے بعد کا ہوگا، گویا جس زمانے میں جمالی دہلوی صاحبِ تصانیف بتایا جاتا ہے ابھی تصوف کے اعتبار سے طفل مکتب ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ جمالی کے ایک بیٹا[1] ۹۲۳ھ میں پیدا ہوا، اگر ۸۶۶ھ میں ان کی عمر ۳۰ سال فرض کر لی جائے (کیونکہ اس سے کم عمر کا آدمی صاحبِ تصانیف کثیرہ نہیں ہوسکتا) تو ۹۲۳ھ میں وہ ۸۷ سال سے کم نہیں ہوتے، ظاہر ہے کہ یہ عمر توالد و تناسل کے لحاظ سے زیادہ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اخبار الاخیار میں ہے کہ شروع میں نام کی رعایت سے جلالی تخلص کرتے تھے، پیر کی ہدایت سے جمالی کر دیا، اس لیے اگر یہ جمالی کی ابتدائی تصانیف ہیں تو ان میں جلالی تخلص ملنا چاہیے۔

آخری بات یہ کہ ۸۶۶ اور ۸۷۶ کے درمیان ۲۶ کتابیں لکھ ڈالیں اور ۸۷۶ اور ۹۴۲ کے درمیان صرف چند کتابیں؟ اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں۔

اس مضمون کے تقریباً ختم ہونے کے بعد مجھے کتابخانۂ مجلس کے کلیات جمالی اردستانی کا علم ہوا، جس کا ابن یوسف شیرازی نے تعارف کرایا، اس کتابخانے میں جمالی کی ۱۴ کتابوں کے علاوہ قصائد، مستزادات، غزلیات، رباعیات اور مفردات وغیرہ کا کافی حصہ موجود ہے، فہرست نگار کے

[1] یہ بیٹا عبدالحی تھا، جو کم عمری میں وفات پاگیا، لیکن اپنے علم و فضل کی وجہ سے کافی نام پایا، اخبار الاخیار میں اس کی بڑی تعریف ملتی ہے۔

نزدیک یہ جمالی اردستانی کی تصانیف ہیں، وہ جمالی دہلوی سے واقف ہی نہیں معلوم ہوتے۔

رسالہ معارف اعظم گڈھ (۱۹۷۹ء) کے چار شماروں میں (فروری تا جون) ڈاکٹر ظفر الہدیٰ مرحوم کے مقالہ کا ترجمہ "جمالی، لودی اور مغل دور کا شاعر" کے نام سے شائع ہوا، مترجم جناب سلطان احمد صاحب ہیں، اس کے تیسرے حصہ میں "مثنویات جمالی" کے نام سے جمالی اردستانی کی پانچ مثنویوں یعنی مصباح الارواح، شرح الواصلین، محبوب الصدیقین، مہر القلوب اور کشف الارواح کا کسی قدر تفصیلی اور پانچ مختصر مثنویوں یعنی فرصت نامہ، نصرت نامہ، قدرت نامہ، فضیلۃ العقل، اور نورٌ علیٰ نور کا بہت اجمالی تذکرہ شامل ہے، اور مضمون کی چوتھی قسط یعنی معارف مئی میں دکھلایا ہے کہ یہ منظومات جمالی دہلوی کے نہیں ہیں، ان کے فیصلہ کی بنیاد یہ قرائن ہیں:

(۱) بیان الحقائق لکھنے سے پہلے چوبیس[۲۴] مثنویاں لکھ چکا ہے، پس یہ کہن سالی کی تصنیف ہے، سیر العارفین اس کے ساٹھ[۶۶] سال بعد لکھی گئی، اس لیے یہ دونوں ایک مصنف کی کتابیں نہیں ہو سکتیں۔

(۲) ان مثنویات کا مصنف شیعہ معلوم ہوتا ہے، جمالی دہلوی سنی تھا۔

(۳) ان مثنویات کا بیان اور انداز بیان جمالی دہلوی کی دونوں مثنویوں سے مختلف ہے۔

(۴) مہر و ماہ اور مرآۃ المعانی جو جمالی دہلوی کی تصانیف ہیں، دلکش انداز میں ہیں، مثنویات بالا کا انداز ایسا نہیں۔

---

[۱] لغت نامہ دہخدا میں جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، اور جمالی اردستانی کی ۱۵ مثنویوں کے نام درج کیے ہیں، ان میں مرآۃ الافراد کا بھی نام شامل کیا ہے جو نثری رسالہ ہے، کچھ چند قصیدے، متعدد غزلیں، دو ایک رباعیاں اور چند مختصر مثنویاں بھی درمیان میں آگئی ہیں، جمالی دہلوی کے پیر کا نام سماء الدین کے بجائے بہار الدین درج ہو گیا ہے۔

[۲] ریحانۃ الادب ج ۱ ص ۲۸۳ میں جمالی کی تصانیف میں چند مثنویوں کے بعد اس کے دیوان، قصائد و غزلیات کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ جمالی اردستانی اور دہلوی میں فرق نہیں کرتے۔

(۵) مثنویات کے نثری حصہ کا سیر العارفین سے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں دو مصنف کے تراوشِ خامہ کا نتیجہ ہیں۔

مگر مضمون نگار یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ یہ مثنویات کس جمالی کی ہیں، وہ جمالی اردستانی سے ناواقف ہیں، بہرحال ان کی یہ بات صحیح نہیں کہ وہ شیعہ تھا، البتہ دونوں کے دوروں کا فرق اور دونوں کے انداز بیان میں تفاوت کا ذکر قبلاً ہو چکا ہے، مضمون نگار نے جمالی (اردستانی) کی گمشدہ مثنویوں کے نام خود جمالی کی دی ہوئی فہرست کی بنیاد پہ لکھے ہیں، یہ وہی مثنویاں ہیں جن کے مختلف نسخوں کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، ان میں اب کوئی گمشدہ نہیں۔

مقالہ ختم کر چکا تھا کہ جمالی کی مثنوی مہر و ماہ کے مطبوعہ نسخے (۱۹۷۴ء) کا فاضلانہ مقدمہ جو پیر حسام الدین راشدی صاحب کے تراوشِ خامہ کا نتیجہ تھا نظر سے گذرا، اس میں انھوں نے جمالی کی طرف منسوب چند مثنویوں کا نام درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا انتساب جمالی دہلوی کی طرف غلط ہے، ان کے نزدیک وہ جمالی اردستانی کی ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے حسب ذیل دلیلیں پیش کی ہیں:

(۱) دونوں کے ذہن و فکر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(۲) منسوب مثنویوں کا مصنف جمالی شیعہ، جبکہ جمالی دہلوی سنی تھا۔

(۳) جمالی دہلوی کی عمر ۸۰ سال فرض کرنے کے باوجود ۸۶۶ھ میں جو منسوب مثنویوں کا سالِ اتمام ہے، اس کی عمر ۴ سال کی ہوگی۔

(۴) جمالی دہلوی کا شروع کا تخلص جلالی تھا، وہ ان مثنویوں میں نہیں ملتا۔

(۵) ۸۶۶ھ اور ۸۷۶ھ کے درمیان چھبیس[۲۶] کتابیں لکھی ہیں اور بعد کی طویل مدت میں صرف چند ہی کتابیں ہیں۔

(۶) سیر العارفین میں ہندوستانی صوفیوں کا نام ہے جو جمالی کی دوسری تصانیف میں بالکل ناپید ہیں۔

یہ سب دلائل وہی ہیں جو گذشتہ صفحے میں بحث میں آچکے ہیں، بہرحال یہ مسلّم ہے کہ یہ جمالی شیعہ نہ تھا۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ پیر صاحب نے اپنے مقدمہ میں پروفیسر سجادی کے مقدمہ کا ذکر کیا ہے، اور ان کے قیاس کو غلط ٹھہرایا ہے۔

جمالی کی منظومات کا جو مجموعہ پروفیسر ضیاء الدین سجادی کے مطالعہ میں تھا، اس کا مخطوطہ پیرس کا ہے (بلوشہ ۱۷۵۷) اس کا عکس تہران یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہے اور اس کا مختصر ذکر فضل اللہ جمالی اردستانی دہلوی کے نام سے ایرج افشار نے فہرست مائیکروفیلمہائے کتابخانۂ دانشگاہ تہران میں کیا ہے، دراصل یہاں جمالی دہلوی اور جمالی اردستانی دونوں کو ملا دیا گیا ہے، البتہ سعید نفیسی کے ایک نسخہ کے ذیل میں شرح الکنوز اور میزان الحقائق کو جمالی اردستانی کی تصنیف قرار دیا ہے۔

یہ مختصر تاریخ ہے جمالی اردستانی اور جمالی دہلوی کی شخصیات کے سلسلہ کی کوشش کی، مگر پروفیسر سجادی کے پیش نظر صرف پیرس کے مجموعہ کا عکس تھا، بقیہ مواد ان کی دسترس میں نہ تھا، تعجب اس پر ہے کہ تہران میں اس سلسلہ میں جو کام ہوا وہ اس سے بھی ناواقف ٹھہرے بہرحال اگر ان کو تھوڑا سا اور مواد مل جاتا تو ان کے مقالہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

سجادی صاحب نے اپنے مقالہ کی خاور شناسوں سے داد چاہی ہے اور مزید اس بنا پر کہ مجھے مصباح الارواح اور دوسری کتابوں کو جمالی دہلوی کی تصانیف ہونے میں تامل تھا اور اس سلسلہ میں یہ مضمون نکل چکا تھا میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرنا ضروری سمجھا۔

جمالی اردستانی تحقیق ادبی کا دلچسپ موضوع ہے مگر یہ کافی مشکل موضوع ہے اور صرف اس شخص کے بس کی بات ہے جو فارسی کے علاوہ تاریخ اور علوم اسلامی میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔

گلدستۂ ہوش افزا بریلی

از

ڈاکٹر لطیف حسین ادیب بریلی

انیسویں صدی عیسوی میں بریلی میں اردو شاعری کا تعلق خاص طور پر دو خاندانوں سے تھا، ان میں ایک خاندان نوابین روہیلہ کا تھا، نیاز احمد خاں ہوش اسی خاندان کے ایک مقتدر اور نامور شاعر تھے، راقم نے ان کے متعلق اپنی کتاب "چند شعرائے بریلی" میں لکھا ہے:

"نیاز احمد خاں ہوش کے اہتمام میں ایک رسالہ "گلدستۂ ہوش افزا" بھی نکلتا تھا جس کی طباعت مطبع نظامی کانپور میں ہوتی تھی، یہ گلدستہ بھی فراہم نہ ہو سکا"[1]

حال میں ہی گلدستۂ ہوش افزا کے پانچ شمارے بابت ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۹۱ھ تا ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ دستیاب ہو گئے، ان میں ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ کا شمارہ ناتمام ہے، اس گلدستہ کے متعلق ضروری معلومات یہ ہیں:

نام گلدستہ: گلدستۂ ہوش افزا ہمیشہ بہار، ضمیمۂ نور الانوار۔

[گلدستہ کے نام میں نواب نیاز احمد خاں کے تخلص یعنی ہوش کی رعایت ہے، گلدستہ کا یہ نام ماہ محرم الحرام سنہ ۱۲۹۲ھ کے شمارے تک ملتا ہے، البتہ اس کی نور الانوار کے ضمیمہ کی حیثیت ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں ختم ہو جاتی ہے، نور الانوار کے متعلق گارساں دتاسی نے یہ اطلاع دی ہے:

---

[1] چند شعرائے بریلی، ص ۱۳۳۔

"نور الانوار ایک اور اخبار ہے جو کانپور سے شائع ہوتا ہے، اس میں زیادہ تر انگریزی اخبارات کے تراجم اور اردو اخبارات کے منتخب مضامین شائع کیے جاتے ہیں، اس میں اکثر منظوم قطعات اور نظمیں بھی شائع ہوتے ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حکومت انگریزی کا مخالف اور سر سید احمد خاں کے خیالات کے خلاف ہے، اڈیٹر اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے لکھا تھا کہ اس اخبار کے لیے زیادہ مناسب نام "ظلمت شعار" تھا، کیونکہ موجودہ لقب اس کی خصوصیات کی ضد ہے، برعکس نہند نام زنگی کافور"[1]

رجسٹرڈ نمبر : ماہ رمضان اور ماہ شوال ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں "رجسٹرڈ نمبر ۳۵ نور الانوار" ہے، مگر ماہ ذیقعدہ اور ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں یہی رجسٹرڈ نمبر ۹۱ اور ماہ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ کے شمارے میں ۲۷ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تک گلدستۂ ہوش افزا ضمیمۂ نور الانوار کی حیثیت سے نکلتا رہا اس کا رجسٹرڈ نمبر ۳۵ تھا، مگر بعد کے شماروں میں رجسٹرڈ نمبر بدل گیا، مذکورہ رجسٹرڈ نمبر کے علاوہ عنوان گلدستہ کے نیچے رمضان اور شوال ۱۲۹۱ھ کے شماروں میں رجسٹرڈ نمبر ۳۴ اور ۳۹ علی الترتیب طبع ہوا، بعد کے شماروں میں اس طرح کا کوئی نمبر نہیں تھا، معلوم نہیں اس نمبر کا کیا مطلب تھا۔

تاریخ اجرا : گلدستہ میں جلد کا قرینہ ہجری سال کے اعتبار سے ہے، یعنی ایک سال کے بارہ[۱۲] شماروں کے بعد نئے سال کا شمارہ نمبر ایک سے شروع ہوتا ہے، مثلاً ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کا شمارہ نمبر ۱۲ پر ختم ہوا، تو ماہ محرم الحرام ۱۲۹۲ھ کا پہلا شمارہ نمبر ایک اور جلد ۳ سے شروع ہوا، ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۹ راگست ۱۸۷۶ء کے شمارہ میں جلد ۲ اور شمارہ نمبر ۹ مندرج ہوا، اس حساب سے جلد (۱) اور شمارہ (۱) کی تاریخ یکم ماہ محرم ۱۲۹۰ھ ہوئی۔

[1] مقالات گارساں دتاسی (۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۳ء تک) ص ۳۴۱۔

قیمت پرچہ : تین آنہ سوائے محصول ڈاک، بحالت پیشگی دو آنہ فی پرچہ، ماہ شوال ۱۲۹۱ھ کے گلدستہ میں قیمت تین آنہ بحالت پیشگی مع محصول ڈاک اور چار آنہ بعد انقضائے یک ماہ شائع ہوئی، مگر ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ اور بعد کے گلدستوں میں قیمت تین آنہ سوائے محصول ڈاک اور بحالت پیشگی دو آنہ طبع ہوئی۔

تاریخِ مشاعرہ : یکشنبہ اول ماہ انگریزی

نام میر مشاعرہ : جناب مولوی حکیم نواب نیاز احمد خاں ہوش نبیرۂ مکرم الدولہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں صاحب بہادر نصیر جنگ مرحوم، شاگرد رشید جناب تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی سید مظفر علی خاں صاحب بہادر، بہادر جنگ اسیر لکھنوی۔

[نیاز احمد خاں ہوش ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے، ان کا شجرۂ نسب یہ ہے : نیاز احمد خاں بن نیاز محمد خاں بن یار محمد خاں بن محمد یار خاں بن نواب حافظ رحمت خاں (متوفی ۱۷۷۴ء) والی روہیل کھنڈ۔ آپ نے فارسی زبان و ادب کی تحصیل بریلی کے معروف شاعر خلیفہ امیر الدین آزاد (متوفی ۱۸۶۷ء) سے کی، فن طب حکیم محمد ابراہیم لکھنوی سے حاصل کیا، ابتدا میں خلیفہ امیر الدین آزاد اور محسن علی خاں جوش بریلوی (متوفی ۱۸۶۳ء) سے فن شعر اکتساب کیا، بعد کو میر مظفر علی اسیر لکھنوی (متوفی ۱۸۸۲ء) کے شاگرد ہوئے، وہ 'تاریخ روہیل کھنڈ' 'مثنوی ترانۂ ہوش' 'حدیقۂ نعت' اور 'کلیات ہوش' کے مصنف تھے، اعلیٰ پایہ کے قصیدہ نگار اور غزل گو تھے، پُر شکوہ غزلیں لکھنے میں ملکہ حاصل تھا، ان کا شمار صف اول کے اساتذۂ بریلی میں کیا جاتا ہے، ان کی وفات ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہوئی، راجہ عنایت سنگھ عنایت نے تاریخ وفات لکھی ؎

از روے الم کہو عنایت تاریخ
"جنت کو گئے نیاز احمد خاں والے"]
۱۳۰۹ھ

مقامِ مشاعرہ : بریلی کتب خانہ سرکار۔

[بریلی میں بازار کتب خانہ اور چوراہہ کتب خانہ اسی "کتب خانہ سرکار" سے موسوم ہیں، شاید ۱۹۶۲ء میں یہ قدیم و خوبصورت عمارت منہدم ہوئی، جس کی جگہ اب گھنٹہ گھر تعمیر کیا گیا ہے، "کتب خانہ سرکار" کی عمارت کو مفتی عنایت احمد نے ۱۸۵۷ء سے پہلے کسی سنہ میں تعمیر کرایا تھا، اس وقت مفتی صاحب بریلی کے صدر امین تھے، وہ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کے جس نے غالب کی دستنبو کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا صدر تھے، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ان کو فتنہ بھڑکانے کے الزام میں سزا دے کر جزائر انڈمان بھیجا گیا، مفتی صاحب کثیر التصانیف تھے، علم الصیغہ اور حبیب اللہ ان کی مشہور تصانیف ہیں، وہ بعد رہائی حجِ بیت اللہ کے سلسلہ میں جدہ کے قریب جہاز غرق ہونے کی وجہ سے فوت ہوئے (۱۷ر شوال ۱۲۷۹ھ مطابق ۹ر مارچ ۱۸۶۳ء)[1]

نام مہتمم و منصرم گلدستہ : سید رحمت علی جنوں، مقیم بریلی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش بریلوی و حافظ عبد الحمید مقیم کانپور، مطبع نظامی۔

تعداد طبع اشعار بے اجرت : یازدہ شعر دیک سطر سرخی، نام صاحب کلام۔

تعداد اجرت طبع اشعار طرح زائد از یازدہ شعر : فی بیت پاؤ آنہ و سُرخی و نام درصورت زیادہ ہونے ایک سطر کے فی سطر پاؤ آنہ مقرر ہوئے۔

تعداد اجرت طبع اشعار غیر طرح: فی بیت آدھ آنہ

قطعۂ تاریخ : از محمد عبد الرحمٰن خاں شاگرد مہتمم مطبع نظامی ؎

چو لالہ غنچۂ گلدستہ ہمیشہ بہار	ز سنگ طبع بصد حسن انتظام شگفت
بعطر بیزئ افضال باغبان ازل	ز شاخ تاک مے لالہ گوں بجام شگفت
گل مراد جہاں از نسیم نکہت بیز	پے نظارۂ عشاق صبح و شام شگفت

---

[1] نزہۃ الخواطر از مولانا عبد الحیٔ ص ۳۴۰، مخزونہ رضا لائبریری رام پور۔

ز شاخ خامۂ شاکر بصفحۂ ایں تاریخ	نوشت بلبل دل "گلشن کلام شگفت"

مصرعۂ طرح گلدستۂ حال : [بابت ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۱ھ]

ع جہاں میں سب سے اعلیٰ مرتبہ پایا پیمبر کا۔

مصرعۂ طرح گلدستۂ آیندہ : ع شکر ہے ہاتھ مرا کاسۂ سائل نہ ہوا۔

مصرعۂ طرح مشاعرہ بابت جنوری: [۱۸ر جنوری ۱۸۷۷ء مطابق یکم ماہ محرم الحرام ۱۲۹۴ھ]

ع فتنۂ محشر بھی بندہ ہے تری رفتار کا۔

[دراصل مذکورہ مصرعۂ طرح میں کلام غزل و نعت ماہ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۲۵ر نومبر ۱۸۷۶ء کے گلدستہ میں طبع ہوا، ہر گلدستے میں مصرعۂ طرح کا قرینہ تین ماہ کی مدت پر مشتمل تھا یعنی مصرعۂ طرح بابت ماہ رواں (رمضان)، مصرعۂ طرح بابت ماہ ثانی (شوال) مصرعۂ طرح بابت مابعد ماہ ثانی (ذیقعدہ) مشاعرہ بریلی کتب خانہ سرکار میں یکشنبہ اول ہر ماہ انگریزی کو منعقد ہوتا، جس کے مصرعۂ طرح کا اعلان دو ماہ پہلے گلدستے کے ذریعہ مشتہر کر دیا جاتا تھا]

تحریر سرورق : بہ نظر دفع حرج انطباع گلدستہ کے یہ التزام کیا گیا ہے کہ سکنائے شہر بریلی غزل اپنی بہت صحیح وصاف لکھ کر مشاعرہ میں اُسی وقت مرحمت فرمایا کریں اور حضرات بیرونجات خواہ شہر بانس بریلی محلہ بازار صندل خاں میں بخدمت فیض درجت جناب نواب صاحب بہادر موصوف پنذرہ روز کے اندر تاریخ انطباع گلدستہ سے خواہ کانپور مطبع نظامی میں پاس مسمی عبد الحمید صاحب منصرم کے روانہ فرمایا کریں اور سکنائے شہر بریلی قیمت اجرت اشعار زائد و اشعار غیر طرح ایک ہفتہ میں خواہ نواب صاحب بہادر کے پاس جمع کریں خواہ کانپور روانہ فرمائیں اور حضرات بیرونجات ہمراہ غزل کے قیمت اجرت روانہ فرمایا کریں، اگر تاریخ طبع گلدستہ سے غزل پندرہ روز پہلے روانہ فرمائیں گے تو بے تامل طبع ہوگی، اور گلدستۂ آیندہ میں شمول کی جائے گی اور جو صاحب

دس گلدستہ فروخت کرائیں گے، اُن کو ایک جلد مفت دی جائے گی، اور جو صاحب پانچ فروخت کرائیں گے، ان سے نصف قیمت ایک گلدستہ کی لی جائے گی، اور جو صاحب مبلغ سے ۳ر سالانہ پیشگی دیں گے ان سے حساب اجرت اشعار زائد نہ کیا جائے گا، کلمات کفر و شرک جس شعر میں ہوں گے وہ شعر نکال دیا جائے گا۔

[نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ کا مکان بازار صندل خاں متصل قلعۂ بریلی تھا، اس مکان میں ہنوز ان کے اہل خاندان رہتے ہیں، صندل خاں بہ زمانہ حافظ رحمت خاں شہر بریلی کا کوتوال تھا، آج کل بازار صندل کی بجائے بزریہ صندل خاں بولا جاتا ہے۔]

تحریر صفحۂ آخر : [گلدستہ بابت ماہ رمضان ۱۲۹۱ھ] صفحۂ آخر پر مندرجۂ ذیل اشتہار طبع ہوا: "یہ گلدستہ ضمیمۂ نور الانوار ہے، اور نور الانوار ہر ہفتے کو چھپتا ہے، اور گلدستہ ہر مہینہ میں ایک دفعہ چھپتا ہے، اور قیمت گلدستہ علاوہ قیمت نور الانوار کے ہے، پس جن مشتریان گلدستہ کو خریداری نور الانوار کی بھی منظور ہو تو ۶ر سالانہ پیشگی اندر میعاد دو ماہ یا عہ سالانہ قیمت مابعد مع محصول ڈاک علاوہ قیمت گلدستہ کے عطا فرما کر طلب فرما لیویں۔"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ نور الانوار کانپور ہفتہ وار اخبار تھا۔

اسی گلدستہ کی تاریخ اشاعت مولوی افضل علی ضوؔ بدایونی نے "غنچۂ بہاری ہے" سے برآمد کی ہے ؎

میرے مخدوم ہیں جو حضرت ہوشؔ	اُن سے کیا جو ہے فیض جاری ہے
یعنی چھپواتے ہیں سبھوں کا کلام	عمدہ اسباب یادگاری ہے
بہر تاریخ سال گلدستہ	ضوؔ کہو "غنچۂ بہاری" ہے

۱۲۹۱ھ

ورق کا سائز : لمبائی ۳۰.۵ سینٹی میٹر × چوڑائی ۱۷ سینٹی میٹر۔ چار کالماں، مسطر ۲۹ سطری

مع عنوانات اوسطاً، گلدستہ کے سرورق اور ورق آخر کے علاوہ گلدستہ کے اندرونی مطالعہ سے مندرجۂ ذیل معلومات فراہم ہوتے ہیں۔

موضوع سخن بہ اعتبار اقسام شعر و نظم } گلدستوں میں زیادہ تر غزلیات اور کمتر قطعات، رباعیات و خمسیات شائع ہوتے تھے، گلدستوں میں مثنویات و قصائد شائع نہیں ہوتے تھے، اسی طرح گلدستوں میں نعتیہ کلام شائع کرنے کا رواج نہیں تھا، نعتیہ گلدستے علٰحدہ چھپتے تھے، ان حقایق کو دیکھتے ہوئے گلدستۂ ہوش افزا کلام شعر و نظم کا بھنڈار ہے جس میں غزلیات طرحی و غیر طرحی وافر تعداد میں طبع ہوئیں، غزلیات میں نعتیہ مضامین پر مشتمل اشعار کے علاوہ مسلسل نعتیہ غزلیں بھی شائع ہوئیں، ان کے علاوہ قصائد و مثنویات نے بھی گلدستے میں جگہ پائی، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) قصیدۂ بہاریہ در مدح شاہ اودھ، تصنیف شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی ؎

ع فلک پر طوطیٔ گردوں الاپتی ہے بہار

(۲) قصیدہ در مدح جناب شفاعت احمد صاحب وکیل عدالت غازی پور عرف محمد صفات احمد خاں المدعو بہ امت خاں صاحب رئیس غازی پور، تصنیف لالہ جوالہ شنکر اسیر شاگرد نسیم دہلوی۔

ع آ گئی فصل بہاری ہے چمن میں دھوم دھام

(۳) سلام، تصنیف نیاز احمد خاں ہوشؔ۔

(۴) قصیدہ در مدح نواب ممتاز الدولہ بہادر لکھنوی، تصنیف شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی،

ع آج کل باغ پہ عالم ہے گھٹا جوبن پر

(۵) خمسہ شیخ علی حسین جنونؔ لکھنوی بر غزل نواب حسام الدولہ بہادر حسامؔ مرحوم۔

(۶) رباعی ہدایت علی ہدایتؔ [بریلوی]

(۷) قطعات تاریخ طبع گلدستہ تصنیف مولوی افضل علی ضوؔ بدایونی، برج موہن لال خمارؔ بریلوی وغیرہ۔

(۸) مثنوی نغان قمر، مسمیٰ نسیم تصمیم در صنعت ذوبحرین از نتائج افکار یکتائے روزگار جناب کمالات انتساب حکیم فخرالدین صاحب حسنیؔ، تخلص قمرؔ، رئیس رائے بریلی ؎

بحر رمل مسدس مقصور — بحر سریع مطوی موقوف

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات — مفتعلن مفتعلن فاعلات

یاس ہے اب عشق کی تاثیر سے — بھر گیا دل نالۂ شبگیر سے

(۹) پچپن (۵۵) بندوں پر مشتمل ایک خمسہ برغزل ناسخؔ، تصنیف بلیغؔ ؎

ع طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

(۱۰) چوبیس (۲۴) بندوں پہ مشتمل ایک مسدس در فضائل درود شریف، تصنیف ہدایت علی ہدایتؔ [بریلوی]

کیفیت گلدستہ: گلدستۂ ہوش افزا میں اساتذۂ لکھنؤ کو خاص طور پر جگہ دی گئی، گلدستے میں جن اساتذۂ لکھنؤ کا کلام شائع ہوا، ان کے اسماء یہ ہیں: شیخ امان علی سحرؔ لکھنوی شاگرد ناسخؔ، نواب ممتاز الدولہ بہادر ممتازؔ لکھنوی، منشی محمد مظفر علی خاں بہادر اسیرؔ لکھنوی، خواجہ محمد وزیرؔ لکھنوی شاگرد ناسخؔ، امام بخش ناسخؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی، آباد [مرزا مہدی حسن خاں لکھنوی] ہادی علی اشکؔ لکھنوی، میر وزیر علی صباؔ لکھنوی۔

[گلدستہ میں ان شعراء کا کلام بھی چھپا جو فوت ہو چکے تھے]

مندرجۂ بالا اساتذہ کے علاوہ ان کے تلامذہ کا کلام بھی گلدستے میں شائع ہوا، اودھ کی بعض

بستیوں جیسے محمود آباد، رائے بریلی، کاکوری وغیرہ کے شعراء نے بھی گلدستہ میں جگہ پائی، چونکہ گلدستہ نوابین و امراء میں باریاب تھا، اس کے صفحات میں بعض تخلص گذار امرائے لکھنؤ و اودھ کا کلام بھی شائع ہوا، اس گلدستہ کے ذریعہ بعض غیر معروف شعرائے لکھنؤ سے واقفیت پیدا ہوتی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نواب خاں بہادر خاں (نبیرۂ نواب حافظ رحمت خاں) کو افواج کمپنی کے مقابلہ میں شکست ہوئی، جس کے نتیجے میں بریلی میں قتل و غارت گری لوٹ مار اور بھگدڑ ہوئی، نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ حیدرآباد دکن گئے اور وہاں سے لکھنؤ پہونچے، انھوں نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں سکون کی سانس لی، مظفر علی خاں اسیرؔ کی شاگردی اختیار کی، لکھنؤ کے امراء سے تعلق پیدا کیا، گلدستۂ ہوش افزا میں شعرائے روہیل کھنڈ کے مقابلہ میں شعرائے لکھنؤ و اودھ کا جگہ پانا ان کی سکونتِ لکھنؤ کی وجہ سے تھا۔

حکومت روہیلہ کے زوال کے بعد (۱۷۷۴ء) بریلی کی شاعری پر اساتذۂ لکھنؤ کے اثرات پڑنا شروع ہو گئے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ تمام شعرائے بریلی جو تحلیل جذبات کی بجائے پرواز خیال کے دلدادہ تھے، اساتذۂ لکھنؤ کے حلقہ بگوش ہو گئے، نیاز احمد خاں ہوشؔ ان شعرائے بریلی کے سرخیل تھے، جنھوں نے دبستانِ لکھنؤ سے مکمل استفادہ کیا۔

اس طرح گلدستۂ ہوش افزا بریلی اس اعتبار سے ادبی اہمیت کا حامل تھا کہ اس نے ان لکھنوی اثرات کی نشاندہی کی جو دبستان بریلی کی شاعری کو متاثر کر رہے تھے۔

بریلی کے پرانے گلدستوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک معروف استاذ اور اس کے تلامذہ سے وابستہ تھے، اور اس میں اسی طرز شاعری کی نمایندگی ہوتی جس کی اشاعت وہ استاذ اور اس کے تلامذہ کرتے، گلدستۂ ہوش افزا بریلی نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ

کے حلقۂ شعراء کا ترجمان تھا، اور وہ اسی طرز شاعری کی اشاعت کرتا جس کے نواب نیاز احمد خاں اور ان کے تلامذہ حامل تھے، اس وقت بریلی میں دیگر بڑے اساتذۂ سخن نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کو مقبولیت عوام وخواص بھی حاصل تھی، مثلاً قاضی عبدالجمیل جنون (تلمیذ غالب، متوفی ۱۹۰۰ء) مولوی حسن رضا خاں حسن (تلمیذ داغ متوفی ۱۹۰۸ء) سید فضل غوث ساقی (متوفی ۱۸۹۴ء) مولانا ناصرالدین احمد ناصر (متوفی ۱۹۰۸ء) غلام بسم اللہ بسمل (تلمیذ غالب، متوفی ۱۸۹۵ء) مفتی عمادالحسن محو (تلمیذ غلام بسم اللہ بسمل، متوفی ۱۹۲۶ء) مرزا رستم یار بیگ قیصر (تلمیذ نواب عبدالعزیز خاں عزیز متوفی ۱۹۲۶ء) بریلی کے معروف اساتذۂ سخن تھے، مگر ان کو گلدستہ میں جگہ نہیں ملی، کیونکہ وہ دبستانِ لکھنؤ سے نسبت نہیں رکھتے تھے۔

بریلی مدت مدید سے علمائے دین کا مرکز رہا، بریلی میں رشد وہدایت کے لیے صوفی بھی آئے اور ان کے مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں، علماء اور صوفیوں کے دور دورے کی وجہ سے نعتیہ شاعری کو فروغ ملا، اور شاید شمالی ہند میں بریلی پہلا ادبی مرکز ہے جہاں سب سے پہلے نعتیہ دواوین مرتب ہوئے، لہٰذا نواب نیاز احمد خاں ہوش کی نعت گوئی اور گلدستۂ ہوش افزا میں نعتیہ کلام کی اشاعت بریلی کے ادبی ماحول کے مطابق تھا، البتہ گلدستہ ہوش افزا کی انفرادیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ اس کے صفحات میں نعتیہ کلام وافر مقدار میں شائع ہوا، حالانکہ وہ ایک نعتیہ گلدستہ نہیں تھا، میرے خیال میں گلدستۂ ہوش افزا کی اس خصوصیت کا سبب نوابینِ روہیلہ کی دینداری تھی، کیونکہ جملہ نوابین روہیلہ کسی نہ کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ اور عالموں اور صوفیوں کے سرپرست تھے۔

مختصر یہ کہ گلدستۂ ہوش افزا اپنے ادبی معیار، وافر کلام شعر ونظم، اعلیٰ کتابت وطباعت اور اشاعتی نظم وضبط کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔

شعراء اور ان کا کلام: گلدستۂ ہوش افزا کے چار مکمل شماروں اور ایک نامکمل شمارہ کو

سامنے رکھ کر میں نے شعراء کی فہرست تذکروں کے انداز میں مرتب کر دی، تاکہ اس گلدستہ کا مطالعہ زیادہ بامعنی ہو جائے، متداول تذکروں کو سامنے رکھ کر قوسین میں بعض ضروری باتوں کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔

احمد: منشی احمد بخش بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

خدا شاہد کہ جس کو عشق ہے روئے پیمبر کا
اسے اندیشہ کیا ہے گرمیِ خورشید محشر کا

ادیب: مرزا اللہ یار بیگ بریلوی، شاگرد برج موہن لال خمار بریلوی تلمیذ ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

رقم کرتا ہوں میں جب وصف گیسوئے پیمبر کا
سیاہی پر گماں ہوتا ہے سب کو مشکِ اذفر کا

احیا: خواجہ محمد یحییٰ خلف خواجہ محمد مرتضےٰ بقا لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

تاؤ کھانا صاف روشن ہے تری تلوار کا
ڈھونڈتی پھرتی ہے سایہ زخم دامن دار کا

اشک: مولوی ہادی علی[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

ہم ہوا کشتہ ہوں میں تیغ نگاہ یار کا
غسل میت کے لیے پانی ملے تلوار کا

اطہر: حکیم محمد آغا مسیح لکھنوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ من کلامہ ؎

بند آنکھیں ہیں لحد میں کچھ خبر ہوتی نہیں
کب تلک دیکھیں شبِ فرقت خبر ہوتی نہیں

اثر: منشی مٹھن لال، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

جب لکھوں مضمون کوئی میں قد دلدار کا
سرو موزوں ہو ہر اک مصرع مرے اشعار کا

اسیر: لالہ جوالا شنکر۔ شاگرد نسیم دہلوی [مرزا اصغر علی خاں تخلص بہ نسیم دہلوی تلمیذ مومن] مصنف قصیدہ در مدح جناب شفاعت احمد صاحب وکیل عدالت غازی پور۔ مطلع قصیدہ ؎

صبحدم باد صبا نے یہ دیا ہم کو پیام
آگئی فصل بہاری ہے چمن میں دھوم دھام

---

[1] ان کے حالات فراہم نہ ہو سکے۔

بہجت: مولوی محمد یوسف خاں ناگپوری، مدرس نائب ہشتم رجمنٹ مدراس، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ من کلامہ ؎

لکھوں کچھ وصف جب میں چہرۂ پر نور سرور کا
ورق دیوان کا میرے ورق ہو مہر انور کا

باقرؔ: سید باقر علی بریلوی، شاگرد سید مہربان علی فرحاںؔ بریلوی [تلمیذ خواجہ حیدر علی آتشؔ لکھنوی] من کلامہ ؎

جو اک آنسو بھی گر جائے گا اپنے دیدۂ تر کا
ابھی ہو جائے گا صحرا میں پیدا چشمہ کوثر کا

بیغ: [منشی سید عسکری مرزا خاں لکھنوی، تلمیذ صفیؔ لکھنوی] پچپن بندوں پر مشتمل ایک خمسہ برغزل ناسخؔ

ع۔ طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

پرویز: منشی مرتضیٰ خاں لکھنوی، شاگرد حکیم سید ضامن علی شوقؔ ابن میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

اٹھایا پھول کی صورت علی نے باب خیبر کا
جہاں قائل ہے زورِ دست بازوئے پیمبر کا

تمیزؔ: سید اکبر علی [بریلوی، شاگرد عاشور علی خاں، سید فرزند علی انجمؔ رضوی، تلمیذ خواںؔ بریلوی ان کے خلف تھے] من کلامہ ؎

نہ ہو اس بات پر کیوں فخر و مباہات تمیزؔ
میری ہر بزم میں وہ زینتِ محفل آیا

توقیرؔ: نواب احمد رضا خاں لکھنوی خلف نواب محمد جعفر خاں نبیرۂ نواب حیدر بیگ خاں، شاگرد حکیم سید ضامن علی شوقؔ۔ نمونۂ کلام ؎

دل نے خود لوٹ لیا صبر کو رہزن ہو کر
ہجر میں رنج دیئے دوست نے دشمن ہو کر

جنونؔ: سید رحمت علی بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

نشاں کچھ ضعف سے ملتا نہیں ہے جسم لاغر کا
اگر ڈھونڈا کسی نے مجکو پایا تار بستر کا

جوہرؔ: جواہر سنگھ لکھنوی، شاگرد خواجہ وزیرؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

نور عرفاں ہو تو سینہ بارگاہ عرش ہے
دل کلس ہے اس کی اک درگاہ عالی جاہ کا

جوشؔ: نواب احمد خاں بریلوی [ابن نواب مستقیم خاں ابن نواب محمد خاں ابن نواب حافظ رحمت خاں، خاندان روہیلہ، بریلی کے معروف شاعر تھے، ان کے مطبوعہ دواوین رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہیں] من کلامہ ؎

سنہرے رنگ کی اوس گل کی یہ تاثیر ہوتی ہے
پہنتے ہی طلائی نقرۂ زنجیر ہوتی ہے

حکیمؔ: سید جعفر حسین لکھنوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

نہیں ملتا ہے بوسہ مصحفِ رخسار دلبر کا
خدا حافظ ہے ان روزوں کلام اللہ مفطر کا

حامدؔ: شیخ حامد حسن کنبوہ بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

تصور جب ہے مجکو گلِ روئے پیمبر کا
تو پھر کھٹکا ہو کیونکر گرمی خورشید محشر کا

حافظؔ: عبدالصمد، شاگرد خواجہ محمد مرتضےٰ خاں بقاؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

شعاعِ مہر کا اس واسطے درکار خامہ ہے
کہ تا لکھوں میں کچھ اوصاف اس روئے منور کا

حیدرؔ: نواب علی حیدر خاں بریلوی [ابن نواب عبدالرزاق خاں رزاقؔ ابن اسحاق خاں ابن مستجاب خاں ابن حافظ رحمت خاں] شاگرد عبدالقادر خاں وحشیؔ رام پوری [تلمیذ شیخ علی بخش بیمارؔ بریلوی، شاگرد مصحفیؔ]

خمارؔ: حکیم برج موہن لال بریلوی، شاگرد نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ [ہوشؔ بریلوی کے محتشم شاگرد تھے' ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں
اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں

حیرت کی بات ہے کہ ہند شعرا پر مشتمل تذکرہ بہار سخن میں خمار بریلوی کا ذکر نہیں ملتا، جب کہ بریلی کے کتنے ہی غیر معروف و نو مشق شعرا اس میں پیش کیے گئے، تذکرہ ہزار داستان یعنی خمخانۂ جاوید کے ذریعہ بھی خمار بریلوی کے ضروری حالات نہیں ملتے] من کلامہ ؎

مجھے ہو خوف محشر کا، ہوں عاشق اُس ستمگر کا — قیامت ایک ادنیٰ سلب ہے فتنہ اس کی ٹھوکر کا

موا ہوں زار ہو کر حسرتِ دیدارِ جاناں میں — کفن ہو سایۂ تارِ نگاہِ حورِ منظر کا

وہ عاشق ہوں جنازے کو بھی میرے بعد مرنے کے — اٹھائیں بلبلیں دے کر کفن پھولوں کی چادر کا

کروں جب حالِ سوزِ دل رقم نامہ میں اے قاصد — حروف انگارے ہوں نقطوں میں ہو اندازہ اخگر کا

خمارؔ اس مہر کا وصف صباحت جب لکھا ہم نے — ہوا مطلع غزل کا اپنی مطلع مہرِ انور کا

خیرؔ: شیخ خیرات علی[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

وجودِ پاک احمد باعث آرائش ہستی — بہارِ گلشن امکاں طفیل اُس ذاتِ اطہر کا

خواہشؔ: حافظ مولا بخش شاہجہان پوری، شاگرد حافظ نثار احمد تائبؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

مرے اربع عناصر میں سما ہے غم یاران سرور کا — علی مرتضےٰ رضؓ، عثمان رضؓ، عمر رضؓ، صدیق اکبر رضؓ کا

دانشؔ: سعادت یار خاں بریلوی، شاگرد حافظ عبد الکریم عقیلؔ، تلمیذ نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

مذہبِ عشق میں جو شخص کہ داخل نہ ہوا — مرتبہ دونوں جہاں میں اسے حاصل نہ ہوا

راحتؔ: سید کاظم حسین، ابن سید محمد حسین فرحتؔ ابن سید سعادت علی عیشؔ ابن میر غلام علی عشرتؔ بریلوی

نمونۂ کلام ؎

کان کے بالے میں بل کھاتا ہے گیسو یار کا — حلقۂ خورشید مسکن ہو رہا ہے مار کا

سحرؔ: شیخ امان علی لکھنوی، شاگرد شیخ امام بخش ناسخؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

ہم نے سونے کے چھڑے پہنائے ہیں اس حور کو — آبِ زر سے آج کھینچا ہے نہالِ طور کو

سرشارؔ: منشی مدن لال، شاگرد خواجہ محمد مرتضےٰ بقاؔ لکھنوی [۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء] نمونۂ کلام ؎

دور کی مہر و محبت میں ضررِ جاں کا نہیں — کیک پروانۂ شمعِ مہ کامل نہ ہوا

---

[1] غیر معروف یا مفروضہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

سپہرؔ: [میر مہدی] لکھنوی [خلف سید مہدی، شاگرد خواجہ وزیرؔ] نمونۂ کلام ؎

باڑھ کے ڈورے سے کچھ انگیا کی ڈوری کم نہیں — گھاٹ جو انگیا کا ہے وہ گھاٹ ہے تلوار کا

شوقؔ: منشی امداد حسین بریلوی ابن منشی محمد بخش، سب اوورسیر محکمہ گراںڈ کپتانی آگرہ، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ من کلامہ ؎

رقم جس دم کرد ل میں وصف گیسوئے معنبر کا — سوادِ خط پہ دھوکا ہو نہ کیوں کر مشکِ اذفر کا

شیفتہؔ: میر نوازش علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی شیداؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

ابھی سر کاٹ لے قاتل نہیں صرفہ مجھے سر کا — گر زانو سے اک سرکش مرے سر کو نہ تو سر کا

شورؔ: سید عبد الرحیم بریلوی، شاگرد میر قاسم علی خواہاںؔ بریلوی [متوفی سنہ ۱۹۳۸ء، تلمیذ امیر الدین آزادؔ بریلوی]

شفیقؔ: رام نرائن، شاگرد منشی دھرمخلصؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

آخر کار ہوا ناصح بہت شرمندہ — پر یہ بندہ تو کسی بات کا قائل نہ ہوا

شفیقؔ دل حزیں کی ہے تمنا دل سے لے اخگر — عنایت ہو اُسے روزِ جزا اک جام کوثر کا

شمسؔ: محمد شمس الدین خوش نویس، شاگرد محمد مرتضےٰ خاں بقاؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

تیرے آتے ہی قیامت میں قیامت آ گئی — منتظر تھا فتنۂ محشر تری رفتار کا

شریفؔ: ظہور الحسین، شاگرد مولوی عبد الغنی [محمد عبد الغنی شاہ تلمیذ محمد ہادی علی اشکؔ]

شمسؔ: حاجی خواجہ احمد بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

بعد مرنے کے یقیں ہے منہ نہ دیکھوں نار کا — ہے بڑا مجکو وسیلہ احمدؐ مختار کا

کون میری سی کہے اے سیم تن مفلس ہوں میں — ساتھ دیتا ہے زمانے میں ہر اک زردار کا

شمسؔ اُس خورشید رو کی یاد کا ہے یہ اثر — نام ہے تار شعاعی میرے جسمِ زار کا

شاکرؔ: [ ][1] بریلوی، شاگرد میر سعادت علی عیشؔ ۔ نمونۂ کلام ؎

---

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

عکس سبزے میں نہیں ہے گیسوئے دلدار کا
دیکھ تو قصرِ زمرد میں ہے مسکن مار کا

شائق : سید احمد حسن خاں بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

دھجیاں رکھیں کیوں نہ ہر دم ابروئے خمدار کا
ہم سپاہی ہیں نہ کیونکر شوق ہو تلوار کا

صبر : حافظ امام الدین دہلوی، شاگرد نواب عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

ہو گیا آئینہ عاشق آپ کے رخسار کا
اب خطاب اس کو عطا ہو مرغِ آتشبار کا

عاشق : عاشق علی بریلوی، شاگرد جنون [سید رحمت علی بریلوی]

عطارد : قاضی وزیر حسن مچھلی شہری، شاگرد مرزا صابر [احمد میرزا، پدر پیارے صاحب رشید، متوفی ۱۸۹۳ء]
نمونۂ کلام ؎

بقدر حوصلہ گردش ہے زیر آسماں سب کو
کہ ہر قطرہ ہے اک گرداب اس دریائے اخضر کا

عتیق : مولوی عتیق اللہ لکھنوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

وہ رشکِ مہر میرے پاس سو دے جب کبھی آکر
بنے تار شعاعی پھر تو ہر اک تار بستر کا

عاقل : شیخ عزیز الدین بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

میں ہوں مداح دل سے مو منو روئے پیمبر کا
مجھے ہو خوف کیونکر گرمیٔ خورشید محشر کا

عقیل : مولوی حیات علی بریلوی ابن مولوی حشمت علی زکی بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

کب حسینانِ دل آزار پہ مائل نہ ہوا
کوئی آفت ہوئی سینہ میں مرا دل نہ ہوا

غنی : محمد عبدالغنی شاہ، شاگرد محمد ہادی علی اشک [غنی ملازم مطبع نظامی کانپور] نمونۂ کلام ؎

وہ موحد ہوں کہ یادِ حق ہے میری زندگی
دم بدم بھرتا ہوں نعرہ دل سے اِلّا اللہ کا

(حاشیہ صفحہ (۲۸۵) خمخانۂ جاوید جلد چہارم میں ایسے بارہ شاعروں کا مذکور ہوا جن کا تخلص شاکر تھا، مگر ان میں سے کوئی بھی سعادت علی عیش کا شاگرد نہیں ہے۔ شاکر بریلوی غیر معروف یا مفرد شدہ شاعر معلوم ہوتا ہے۔

ذوق : لالہ گوبند پرشاد بریلوی، شاگرد برج موہن لال خمار بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

شمع گل ہو گئی کچھ رنگ ہوا اور سے اور
بے حجابانہ وہ گل جب سرِ محفل آیا

نقیر : لالہ کیولا پرشاد[1] [ ] نمونۂ کلام ؎

شکر اے دل کہ جناب شہ طٰہٰ آئے
جلوۂ عرش بریں رونقِ بطحا آئے

از سمک تا بہ سما دھوم مچی آتے ہیں
صاحبِ تاج و علم شاہِ شہنشاہ آئے

مصطفٰے حق نے کہا آپ کو اے ختمِ رسل
ہادیٔ شرع متیں دینِ مصفّا آئے

صفحۂ دینِ غلط پہ خط نظر کھینچی
مالکِ لوح و قلم باعثِ املا آئے

اپنے بندوں پہ کیے حق نے کرم ڈر دل جہاں
معدنِ جود و عطا حضرت اعلیٰ آئے

جس کے خدام سے اعجاز مسیحائی ہے
دردمندانِ دو عالم کے مداوا آئے

یاد مولا سے نہ غافل ہو فقیر عاجز
حلِ مشکل کو ترے دیکھ یہ مولا آئے

نہم : منا لال بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوش۔ نمونۂ کلام ؎

رقم ہو جائے کچھ بھی وصف جب ابروئے دلبر کا
گماں دیوان کے لفظوں پہ ہو خنجر کے جوہر کا

فدوی : شیخ نثار احمد بریلوی، شاگرد امام الدین خاں صبر دہلوی۔ نمونۂ کلام ؎

تصور ہے مجھے صلِّ علیٰ اس روئے انور کا
دکھا دے جلوہ اے اللہ تو اپنے پیمبر کا

قیصر : مرزا علی جان بیگ، شاگرد میر قاسم علی خواہاں۔ نمونۂ کلام ؎

ہم لٹے عاشق زلف بت پُر فن ہو کر
نقد دل مار لیا مار نے رہزن ہو کر

کوکب : شیخ یحییٰ علی کاکوروی، شاگرد نواب عبدالعزیز خاں عزیز۔ نمونۂ کلام ؎

اس لیے نظارہ وہ کرتے ہیں مجھ زار کا
سایہ پڑتا ہے غضب بیمار پہ بیمار کا

---

[1] ان کے حالات فراہم نہ ہو سکے۔

لطیفؔ: جعفر حسین کانپوری، شاگرد غنیؔ [محمد عبد الغنی شاہ تلمیذ محمد ہادی علی اشکؔ] نمونۂ کلام ؎

بھول کر ابلیس بہکانے کو آ سکتا نہیں رات دن ورد زباں ہے لفظ استغفار کا

محسنؔ: سید محسن علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی عیشؔ بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

کھینچ کر خنجر خونخوار جو قاتل آیا سر بکف سامنے فوراً دلِ بسمل آیا

مضطرؔ: سید محمد جان بریلوی، شاگرد مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی۔ نمونۂ کلام ؎

نہ ہوتا واسطہ لازم اگر ذاتِ پیمبر کا عقول عشرہ کو ہرگز نہ ملتا رتبہ جوہر کا

ہیولیٰ اور صورت میں نہ ہوتا اقتران گز نہ ہوتا علت غائی جو عنصر ذاتِ اطہر کا

زمان آخریں کو ہے تقدم بالشرف حاصل مقدم ہے ظہور پاک سے رتبہ موخر کا

منصبؔ: سید منصب علی بریلوی، شاگرد میر سعادت علی شیداؔ۔ نمونۂ کلام ؎

مرے چشمک ہے آنکھوں میں طلائی رنگ سے ان کے کہ جیسے دو حریفوں میں پڑے جھگڑا کہیں زر کا

مشہدیؔ: [1] [ ] نمونۂ کلام ؎

دریغا یہ قسمت میں ہے جمع غم کہ ایک فریب غم رقم مجذور ہے

ممتازؔ: نواب ممتاز الدولہ بہادر لکھنوی [2] [ ]

ران کی مچھلی دکھا دے اے صنم مچھلیاں ہوں پانی پانی نہر میں

مہرؔ: عبد اللہ خاں [3]۔ [ ]

نام خدا ہے اوج مرے قال و قیل کا پایا ہے پایہ شعر نے عرش جلیل کا

محمودؔ: محمود خاں رام پوری، شاگرد میر احمد علی رساؔ رام پوری و نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

سایۂ بالِ ہما کو ہم ملائیں خاک میں ہم کو مل جائے اگر سایہ تری دیوار کا

---

[1]، [2]، [3] مزید حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

مضطرؔ: منشی جانکی پرشاد بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

کشتہ ہوں اے ہمدمو میں سبزۂ رخسار کا تختۂ تربت پہ میرے رنگ ہو زنگار کا

مخلصؔ: منشی دھر کاکوروی، شاگرد مولوی عبد الرزاق خالقؔ۔ نمونۂ کلام ؎

جب چھٹی زلف دوتاہ وہ شوخ یوں کہنے لگا ڈر نہیں مخلص مگر تجھ کو ہماری مار کا

نیرؔ: مولوی محمد علی حیدر بدایونی، شاگرد دلدار علی مذاقؔ بدایونی [متوفی ۱۸۹۶ء تلمیذ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ]

نمونۂ کلام ؎

غم شبیر میں آنسو جو نکلے ان میں ڈوبا ہے کفن دینا عزیزو تم مجھے اس دامنِ تر کا

ہوشؔ: نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ بریلوی، شاگرد امیر الدین آزادؔ و میر مظفر علی خاں اسیرؔ لکھنوی] نمونۂ کلام ؎

عروج اتنا بڑھا ہے فضلِ رب سے طبعِ انور کا کہ رشک اوجِ مضامیں پہ ہے معراجِ پیمبر کا

زمینِ شعر سے ہے پست رتبہ چرخِ اخضر کا مرا چوٹی کا مضموں کنگرہ ہے عرشِ اکبر کا

چراغِ کعبہ معنی ہیں تو بندش پوشش کعبہ مری ہر بیت میں انداز ہے اللہ کے گھر کا

وہ میری نظم کا ہے دبدبہ جو ہر فرشتے کو گماں ہر صفحۂ دیواں پہ ہے دیوانِ محشر کا

یہ قدرت کی ہے میرے قلم میں یک قلم قدرت مرے دیواں کی جدول کا ہے ہر تو خط مقدر کا

شہِ ملکِ معانی ہوں نہیں کس جا عمل میرا کتاب نظم عالم اک ورق ہے میرے دفتر کا

زمانہ میرے میدانِ قلم کا ایک کونا ہے جسے کہتے ہیں خط استوا ڈورا ہے مسطر کا

کسی کا طائرِ فکر اڑ سکے کیا میری مدحت میں قلم بہر شنا در کار ہے جبریلؑ کے پر کا

خیال نعتِ حضرتؐ سے یہ پایا مرتبہ میں نے وگرنہ ذرۂ ناچیز ہوں لیکن اسی در کا

عبث خورشید محشر گرمیاں کرتا ہے اے گردوں وہ ذرہ بھی نہیں اس آفتاب ذرہ پرور کا

دم آخر جو مژگانِ نبی کا دھیان آ جائے کھلے فصدِ رگِ عصیاں کیے وہ کام نشتر کا

دعا ہے یہ مدینہ میں مجھے بلوائیے شاہا — بھروسہ اب نہیں ہے عالمِ فانی میں دم بھر
بہت پھرتا رہا ہیں گردشِ قسمت سے ہر جا پہ — میسر ہو طواف اب مجکو حضرت آپکے در کا
ملوں آنکھیں میں جاکر روضۂ اکبر کی کرسی — کہ ہو اس مردمِ دیدہ کو دعویٰ نورِ اختر کا
نہ رکھا گو مجھے عصیاں نے اس قابل کہ میں دم بھر — بنوں زاغِ سیہ بھی اس زمینِ پاکِ اطہر کا
مگر لطف و کرم سے شاہ کے امید ہے تب بھی — میں گو بدکار ہوں پر نام لیوا ہوں پیمبر کا
تماشا دیکھنا اے ہوشؔ تو صحنِ قیامت میں — کہ سر پہ میرے ہوگا چتر دامن آلِ اطہر کا

نسیمؔ : مرزا اصغر علی خاں، دہلوی [شاگرد مومنؔ] نمونۂ کلام ؎

کیا ملے وہ زخم ازل سے جس کو تو بخشے فراق — خاک کر سکتا نہیں بخیہ شگافِ آہ کا

نالاںؔ : سید عنایت نبی، بریلوی، شاگرد سید مہربان علی فرحاںؔ، بریلوی [تلمیذ آتشؔ لکھنوی]

نمونۂ کلام ؎

ضعف سے عالم ہوا یہ مجھ جگر افگار کا — مل گیا تارِ کفن سے تارِ سبحِ زار کا

نورؔ : نواب نور الحسن کنبوہ، بریلوی، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

دھیان جب فرقت میں آیا اس گلِ رخسار کا — داغ دل میں میرے عالم ہو گیا گلزار کا

نویدؔ : بریلوی [ ] نمونۂ کلام ؎

چل دیا بوسۂ رخسار پہ بدظن ہوکر — دوست نے کام بگاڑا مرا دشمن ہوکر

نساخؔ : مولوی عبدالغفور بہادر، ڈپٹی کلکٹر [ابو محمد عبدالغفور پسر قاضی فقیر محمد، ساکن فرید پور بنگال، ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ راج شاہی بنگال، شاعر، ناقد، تذکرہ نگار، مولف تذکرۂ سراپا سخن، مرزا غالبؔ سے خط و کتابت کا تعلق تھا] نمونۂ کلام ؎

ہ غیر معروف یا مفروضہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔

جب گیا شانے کے نیچے رات گیسوئے یار کا — ہاتھ آیا عالمِ رویا میں مضموں مار کا
شاخِ شبو کی قلم ہو غنچۂ دل ہو دوات — وصف لکھنا ہے مجھے اس گل کے ہی ہار کا
وصف اے نساخؔ ترک تیغ زن کا گر لکھوں — کاٹ کام کر جائے بھی پھل ہو جائے گا تلوار کا

واجدؔ : سید واجد علی، ساکن اورنگ آباد، ضلع بلند شہر، شاگرد نیاز احمد خاں ہوشؔ۔ نمونۂ کلام ؎

پسِ مردن نہ کیونکر نشہ ہو عشرت کے ساغر کا — سلامی ہوں میں اک بندہ قسیمِ حوضِ کوثر کا

وحشیؔ : عبدالقادر خاں رام پوری، شاگرد شیخ علی بخش بیمارؔ [بریلوی، متوفی ۱۸۶۵ء تلمیذ مصحفیؔ]

نمونۂ کلام ؎

کیجئے کوئی اشارہ ابروئے خمدار کا — ہاں بھلا ہم بھی تو دیکھیں کاٹ اس تلوار کا

ہدایتؔ : ہدایت علی [بریلوی، برادرِ اکبر مہربان علی فرحاںؔ بریلوی، استاذ درسیات نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ، خود درسیات میں شاگرد مفتی محمد عیوض کے، صاحبِ دیوان و صاحبِ تلامذہ] نمونۂ کلام ؎

لیا ہے نام دل میں مصطفےٰؐ کا — زباں پر ورد ہے صلِّ علیٰ کا
کسی کو زہد و تقویٰ کی ہے امید — مجھے ہے آسرا خیر الوریٰؐ کا
غمِ احمدؐ سے ہے دل پارہ پارہ — عجب نسخہ ملا ہے کیمیا کا
ہدایت مانگ لے جو مانگنا ہو — یہ ہنگام اجابت ہے دعا کا

یوسفؔ : شیخ یوسف علی، بریلوی، شاگرد مہربان علی فرحاںؔ، بریلوی۔ نمونۂ کلام ؎

نور اللہ کا چمکا رخِ روشن ہوکر — رہ گیا وادیٔ دل وادیٔ ایمن ہوکر

تذکروں کی ترتیب و مطالعے کے وقت ہمعصر گلدستوں سے مدد نہیں لی جاتی، حالانکہ ان کے ذریعہ شاعر کا نام، مولد، تخلص، تلمذ اور کلام بھی فراہم ہو جاتا ہے، اور ہمعصر ادبی میلان کا پتہ بھی چل جاتا ہے، لہٰذا قدیم و جدید گلدستوں کو متعارف کرانا اہم ادبی کام ہے۔

شاہنامۂ فردوسی میں ہجو و طنز کے مقامات

از ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی صاحب گورنمنٹ کالج لاہور، پاکستان

(۲)

گودرز کے مطابق آسمان میں جانے کا ارادہ کرنا دیوانوں کا کام ہے، وہ کاؤس کو بے حد خود غرض اور ایسا آدمی قرار دیتا ہے جو ہوش و خرد سے عاری اور دین و رائے سے بیگانہ ہے، اس کا دل بھی ٹھکانے نہیں اور غالباً اس کا سر بھیجے سے خالی ہے، کیونکہ اس کی ہر سوچ اور اس کی ہر فکر کسی جدت اور خوبی سے خالی ہوتی ہے اور وہ پاگلوں کی طرح عقل و خرد سے فارغ ہونے کے سبب معمولی معمولی بات پر متزلزل ہو جاتا ہے۔

چو کاؤس خود کامہ اندر جہان — ندیدم کسی از کہان و مہان
خرد نیست او را نہ دین و نہ رای — نہ ہوشش بجای است و نہ دل بجای
تو گوئی بسرش اندرون مغز نیست — یک اندیشۂ او ہمی نغز نیست
چو دیوانگانست بی ہوش و رای — بہر باد کآید بجنبد ز جای [1]

کاؤس نے تو ابلیس کے بہکانے پر آسمان پر چڑھائی کی تھی، لیکن ضحاک نے اسی (ابلیس) کے اکسانے پر اپنے باپ کو قتل کر دیا، تاکہ اس کے تخت پر قابض ہو سکے، فردوسی یہ واقعہ بیان کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ حقیقی بیٹا کبھی ایسے بُرے اور ظالمانہ فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا، ہاں اگر وہ ناجائز اولاد ہو تو ایک بات ہے، فردوسی نے یہاں جس انداز میں

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۱۴۰

ضحاک کو ناجائز اولاد ثابت کیا ہے، وہ شاعری میں اس کی مہارت و استادی کی دلیل ہے، بالخصوص اس شعر "مگر در نہانی ..... الخ" کو ہجو و ذم کے اشعار کا شاہکار کہا جا سکتا ہے، فردوسی کسی دانا کے حوالے سے کہتا ہے کہ برا فرزند اگرچہ شیر نر ہی کیوں نہ ہو باپ کا خون گرانے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا، ہاں کوئی خفیہ معاملہ ہو تو پھر تجسس کرنے والے کو ماں کے "راز" کی تلاش ہوگی، ضحاک کو اس طرح بالواسطہ طور پر ناجائز اولاد کہہ کر فردوسی نے اس کے لیے صرف بیگانہ، بیدادگر اور سبک مایہ (گھٹیا) ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، حالانکہ اس فعل پر اسے بڑے کوسنے دیے جا سکتے تھے۔

بخون پدر گشت ہمداستان — ز دانا شنیدستم این داستان
کہ فرزند بد گر بود نرّہ شیر — بخونِ پدر ہم نباشد دلیر
مگر در نہانی سخن دیگر است — پژوہندہ را راز با مادر است
پسر کو رہا کرد رسم پدر — تو بیگانہ خوانش مخوانش پسر
سبک مایہ ضحاک بیدادگر — بدین چارہ بگرفت گاہ پدر [1]

توران کے بادشاہ افراسیاب نے طوس کے بیٹے کیخسرو کو صلح کا پیغام بھیجا ہے، کیخسرو اس پیغام کو سراسر فریب و دروغ سمجھتا ہے، چنانچہ اس کا جواب دیتے ہوئے وہ طنز کا لہجہ اختیار کرتا ہے، وہ افراسیاب کو چرب زبانِ محض اور اس کے باطن کو خباثت آلودگی سے پُر قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو تو ایزد پرست بھی نہیں ہے، اس کے نزدیک

[1] ایضاً ص ۴۰، محمد علی فروغی مرحوم انہی اشعار کو بطور مثال پیش کر کے لکھتے ہیں کہ فردوسی ہمارے اکثر شعراء کے برعکس اپنی زبان کو ہزلیات اور بیہودہ گوئی سے آلودہ نہیں کرتا اور اگر کہیں موقع و محل کے مطابق اسے کسی شرم آمیز بات کا ذکر کرنا ہی پڑ جائے تو وہاں وہ بہترین اور لطیف ترین عبارات سے کام لیتا ہے جیسا کہ ان اشعار میں نظر آتا ہے (خلاصۂ شاہنامہ، مقدمہ ص ۱۰)

افراسیاب کی سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ وہ عقل و دانش سے بہرہ ور نہیں، اور کسی جادو کی طرف مائل ہے، ہر چند اس کی زبان خاصی چرب و شیرین ہے لیکن کوئی بھی دانشمند ایسے فریب کار اور دروغ گو کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، ایک موقع پر افراسیاب نے کیخسرو کے والدین پر بہت ستم توڑے تھے، وہ ان کا ذکر کر کے اسے بدگوہر کہتا، اور اس کے اس فعل کو نامردی سے تعبیر کرتا ہے، اور اس ظلم و ستم کی بنا پر اسے سزاوارِ دوزخ ٹھہراتا ہے،

تراچند خواہی سخن چرب ہست بدل نیستی پاک و یزدان پرست
دلت جادوئی را سرمایہ گشت سخن بر زبانت چو پیرایہ گشت
زباں چرب گویا و دل پُر دروغ بر مرد دانا نگیرد فروغ
بجنیرت آن گوہر بد زجای بیفگندی آن پاک دل راز پای
کسی گر بدیہات گیرد شمار فزوں آید از گردشِ روزگار
دری از بدیہا تو بکشادہ ای نہالی بہ دوزخ فرستادہ ای [1]

اسفندیار اپنی ماں سے باتیں کر رہا ہے، باتوں کے دوران عورتوں کا ذکر آتا ہے تو وہ عورتوں کی مذمت شروع کر دیتا، اور انھیں ہجو کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق عورتیں راز چھپانے کے معاملے میں بڑی کوتاہ اندیش اور ناقابلِ اعتبار واقع ہوئی ہیں، ادھر کسی کا بھید ان تک پہنچا اُدھر وہ دوسروں تک لے اڑیں، اس لیے انہیں اپنے کسی راز سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے، پھر یہ کہ وہ کم عقل اور کوتاہ دانش بھی ہیں اس لیے ان کا مشورہ بیکار اور بے وقعت ہوتا ہے،

[1] خلاصہ شاہنامہ، ص ۳۲۷ ۔ ۳۲۹ ۔

....

گویا ان کے مشورے سے بھی بچنا چاہئے، اس کے نزدیک اگر خدانخواستہ کوئی عورت فرمانروا بن بھی جائے تو کوئی بھی اسے وہ احترام نہ دے گا جو کسی مرد فرمانروا کو دیا جاتا ہے،

ان اشعار میں حرف نون بالخصوص لفظ "زن" کی تکرار سے ترنم پیدا ہو گیا ہے، اس ہجو میں بھی کوئی تلخی یا گالی گلوچ کا عنصر نہیں ہے، جس کی بنا پر اسے ہجو ملیح کہا جا سکتا ہو،

چنین گفت با مادر اسفندیار کہ نیکو زد ایں داستاں ہوشیار
کہ پیش زنان راز ہرگز مگوی چو گوئی، سخن باز یابی بکوی
بکاری مکن نیز فرمان زن کہ ہرگز نیابی زنی رای زن
زنی گر جہان شد بفرمانِ اوی بر او نباشد گرامی چو شوی [1]

بہرام گور عورتوں کا بڑا رسیا ہے، اگرچہ اس کے شبستان میں سو سے زیادہ عورتیں ہیں، لیکن جہاں کہیں اسے کوئی نئی لڑکی نظر آجاتی ہے، وہ فوراً اسے بیاہ لیتا ہے، ایک موقع پر وہ شکار کے لیے کسی مرغزار میں گیا ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک گڈریے سے ہوتی ہے جو اسے ایک گوہر فروش اور اس کی لڑکی کے بارے میں بتاتا ہے، بہرام اس لڑکی کی آرزو لیے لشکر سے جدا ہو کر اس طرف روانہ ہو جاتا ہے، اس موقع پر ایک لشکری جس کا نام روزبہ ہے، بہرام کی اس بری عادت اور حرص و جوسی کے بارے میں دوسروں کے سامنے اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے، ان اشعار میں شوخی و طنز بھی ہے، اور ہجو و ذم بھی، اس سلسلے میں بہرام کی اچھل کود، لڑکی والوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کی حرکت اور عورتوں سے سیر نہ ہونے کی عادت کی

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۳۴۴

....

بڑے دلکش اور اچھوتے انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے، آخر میں روزبہ عورتوں کے قریب سے پیدا ہونے والے نقصانات کو ایک ایک کرکے بیان کرتا ہے، اور اس طرح بالواسطہ طور پر عورتوں کی بھی ہجو بیان ہوگئی ہے،

چنین گفت با مهتران روزبه   که اکنون شود شاهِ ایران بده
بگوید درِ خانِ گوهر فروش   همه سوی گفتار دارید گوش
بخواهد مرآن دخت را از پدر   نهد بی گمان بر سرش تاجِ زر
نیابد همی سیری از خفت و خیز   شبِ تیره زو جفت گیرد گریز
شبستان مرا و را فزون از صد است   شهنشاه ازین گونه باشد بد است
تبه گردد از خفت و خیز زنان   بزودی شود دست چون بی تنان
کند دیده تاریک و رخسار زرد   بتن سست گردد و بلب لاجورد
ز بوی زنان موی گردد سپید   سپیدی کند زین جهان ناامید
جوان را کند گوژ بالای راست   زکار زنان چند گونه بلاست [1]

ایک موقع پر ایران کا بادشاہ شاپور دوم تاجر کے لباس میں روم گیا، وہاں کسی ایرانی باشندے کی مخبری پر قیصر کے ہاتھوں گرفتار ہوا، قیصر کے حکم پر اس کے ہاتھ باندھ کر اسے گدھے کی کھال میں سی دیا اور ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا، لیکن شاپور قیصر کی ایک کنیز کی اعانت سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا، اور ایران پہنچ گیا، بعد میں ان دونوں میں لڑائی ہوئی، قیصر شکست کھا گیا، اور اسے شاپور کے سامنے پیش کیا گیا، شاپور کو اس موقع پر گذشتہ واقعہ یاد آجاتا ہے، اور وہ اس کے حوالے سے قیصر کو

[1] خلاصۂ شاہنامہ، ص ۶۴۹-۶۵۰۔

ہجو و ذم کا نشانہ بناتا ہے، اب اس کا لہجہ بڑا تند ہوجاتا ہے، وہ اسے ناقابلِ برداشت الفاظ (مثلاً بدسرشت، ترسا، دشمن ایزد، دیوانہ، فریبی اور بری نسل کا برا فرد) سے خطاب کرتا، اور کہتا ہے کہ تجھے دروغ گوئی کے سوا اور کیا آتا ہے، پھر وہ دروغ کو بے فروغ آتش قرار دیتا، اور قیصر کی حمیت و غیرت کو یہ کہہ کر جوش دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اگرچہ تو قیصر ہے لیکن نہ تو شرم ہی تیرے قریب پھٹکی ہے، اور نہ تیرا دل ہی کسی خوبی سے آراستہ ہے، آخر میں شاپور ایک بھرپور طنز کے ساتھ قیصر کو گذشتہ واقعہ کی یاد دلاتا اور اس کی موجودہ لشکر کشی کا ذکر کرتا ہے۔

بدو شاه گفت ای سرشت بدی   که ترسائی و دشمن ایزدی
فریبنده هستی و دیوانه ای   بر بد نژادی و بیگانه ای
ندانید گفتن سخن جز دروغ   دروغ آتشی بد بود بی فروغ
اگر قیصری شرم درایت کجاست   بخوبی دلِ رهنمایت کجاست
چو بازارگانان به بزم آمدم   نه با کوس و لشکر برزم آمدم
تو همان بنام خر اندر کشی   با ایران گرائی و لشکر کشی؟ [1]

انوشیروان اپنے دربار کے امراء سے خاقانِ چین، ترکوں اور ہیتالیوں سے جنگ اور موافقت کے بارے میں صلاح و مشورہ کرتا ہے، یہ باخبر اور تجربہ کار امراء اہل ہیتال کی بعض برائیوں سے آگاہ ہیں، چنانچہ جس انداز میں وہ ان کا ذکر کرتے ہیں،

[1] خلاصۂ شاہنامہ، ص ۶۲۵۔

....

وہ ذم کا پہلو لیے ہوئے ہے، ان کے مطابق ہیتالی کے لوگ شیطان صفت، منافق اور دشمنِ ایران ہیں، برائی اور خرابی ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے، ناگہاں قتل و غارت اُن کا شیوہ ہے، چنانچہ فیروز کو انھوں نے اسی بے خبری میں مار ڈالا، ان امر کا رویہ ان کے بارے میں اتنا سخت ہے کہ وہ انھیں (اہل ہیتال کو) ایک دن کے لیے بھی خوش دیکھنے کو تیار نہیں ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان بد سرشتوں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا ضرور ملنی چاہیئے، ان کا ذکر بھی ان امرا کو شاق گذرتا ہے، ان سے ہمدردی تو بڑی دور کی بات ہے،

همه مرز هیتال آهرمنند　　دو زدیند و این مرز را دشمنند

بدیشان سزد هرچه آید ز بد　　هم از شاه گفتار نیکو سزد

از یشان اگر هستی کین و درد　　جز از خون آن شاهِ آزاد مرد

بکشتند پیروز را ناگهان　　چنان شهریاری چراغِ جهان

مبادا که باشند یک روز شاد　　که هرگز نخیزد ز بیداد داد

چنینست بادافره دادگر　　همه بدکنش را بد آید بسر

ز هیتال و از لشکر غاتقر　　مکن یاد و تیمار ایشان مبر[1]

بزرجمہر (نوشیرواں کا وزیر جو اپنی عقل و دانش کے لیے مشہور رہے) نے نوشیرواں کے لیے ایک پند نامہ تیار کیا جس میں دس قسم کی چیزوں اور انسانوں کو ہدف ہجو بنایا گیا ہے، اس کے مطابق آز (حرص) اور نیاز (حاجت و ضرورت) بڑے ہی قوی اور سرکش شیاطین ہیں، ان کے علاوہ خشم، حسد، ننگ اور کینہ ہیں، انسانوں میں چغل خور، منافق اور ناپاک دین لائق مذمت ہیں، جب کہ دسویں زمرے میں وہ شخص آتا ہے جو ناسپاس

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۱۴۶؛ شاہنامۂ فردوسی چاپ نفیسی ص ۲۴۱۸ -

اور خدا ناشناس ہے، نوشیرواں اس سے پوچھتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ طاقتور شیطان کون ہے؟ بزرجمہر ان میں سے بعض کی طاقت اور درجہ کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر کے بارے میں بتاتا اور ان کی بدی و زشتی کا ذکر کرتا ہے، وہ ان چیزوں کی تجسیم کر کے ان کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے،

آز ایک ستمگار اور دیر ساز دیو ہے جو کبھی سیر اور خوش نظر نہیں آتا اور جو ہر وقت اور ہمیشہ ہل من مزید کا نعرہ لگاتا رہتا ہے، جب کہ دیو نیاز غم واندوہ اور درد سے اندھا اور زرد رخسار ہے، دیو حسد اس سے کسی قدر کمتر درجہ کا ہے، یہ اس مریض کی طرح ہے جس کا کوئی طبیب نہ ہو، دوسرے لفظوں میں، ع ایسے بیمار کا مرنا ہی دوا ہوتا ہے، اگر دیو حسد کسی کو کبھی، خوش و خرم اور خوشحال دیکھتا ہے، تو پریشان اور مضطرب ہو جاتا ہے، اس کے بعد دیو تمام (چغل خور) کا درجہ آتا ہے، جو دروغ ہی کو اپنی گفتار کے فروغ کا سبب جانتا ہے، یہ چغل خور اور منافق دیو خدا سے بھی نہیں ڈرتا، اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ دو انسانوں کے درمیان دشمنی و کینہ کا بیج بوئے اور یوں انھیں ایک دوسرے سے دور کر دے۔

جیسا کہ بیان ہوا یہ پند نامہ نوشیرواں کے لیے تیار کیا گیا، دراصل بزرجمہر نے ان برائیوں کی اس طرح تصویر کشی کر کے انھیں مہیب و ضرر رساں ثابت کیا اور بالواسطہ طور پر ان سے بچنے کو کہا ہے اور یہ وہ انداز ہے جو براہ راست انداز سے کہیں زیادہ پُر تاثیر ہے،

چنین داد پاسخ که "آز و نیاز　　دو دیواند بازور و گردن فراز

دگر خشم و رشک است و ننگ است و کین　　چو نمام و دو روی و ناپاک دین"

چنین داد پاسخ بکسری که "آز　　ستمگاره دیوی بوَد دیر ساز

که او را نبینند خشنود هیچ　　همه در فزودنش باشد بسیچ

نیاز آن کہ او راز اندوہ و درد — ہمہ گونہ بیند و رخسارہ زرد
گزین بگذری خسرو او یور شک — یکی دردمندی بود بی پزشک
اگر در زمانہ کسی بی گزند — ببیند، شود جانِ او دردمند
دگر دیو نمام کو جز دروغ — نداند، نراند سخن با فروغ
نماند سخن چین و دو روی دیو — بریدہ دل از ترس گیہان خدیو
میان دو تن جنگ و کین افگند — بکوشد کہ پیوستگی بشکند[1]

کسریٰ برے کاموں اور بری باتوں کے بارے میں بزرجمہر سے سوال کرتا ہے، بزرجمہر اسے بتاتا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے درشتی اور سختی اور بے گناہ لوگوں کو آزار رسانی قابلِ مذمت بات ہے، پھر وہ ایسے تو انگر کو جو کھانے پینے وغیرہ میں بخیل و خسیس ہو اور ایسی عورت کو جو بے شرم اور بلند آواز ہو لائق ذم قرار دیتا ہے، اس کے مطابق تند خو نیک مرد اور وہ تنگدست لوگ بھی جو عظمت و بلندی کے جویا ہیں، لائق تحسین نہیں ہیں، اسی طرح جھوٹ خواہ وہ بادشاہ کی طرف سے ہو خواہ عام آدمی کی طرف سے، ذلت آور ہے، اور قدر و قعت سے عاری، ان تمام کا تعلق زشتی اور بدی سے ہے، گویا ان کا ذکر اس انداز میں کر کے اس نے ان کی تذمیم کی ہے۔

چنین داد پاسخ کہ زفتی ز شاہ — ستیہیدن و مردم بی گناہ
تو انگر کہ تنگی کند در خورش — دریغ آیدش پوشش و پرورش
زنانی کہ ایشان ندارند شرم — بگفتن ندارند آواز نرم
ہمان نیک مردان کہ تندی کنند — دگر تنگدستان بلندی کنند

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۷۰ ۔ شاہنامہ (نفیسی) ص ۲۴۵۱

دروغ آن کہ بی ننگ و شرم است خوار — چہ بر پای کاری چہ بر شہریار[1]

بہرام چوبینہ، خسرو دوم سے جنگ کے لیے آیا ہے، جنگ سے قبل دونوں کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے ہیں، مثلاً بہرام تند لہجے میں خسرو کو بدنشان کہتا اور اس کے کردار کو بے عقلوں کے کردار و گفتار سے مشابہ قرار دیتا ہے، پھر وہ طنز سے اسے کہتا ہے کہ تو نہ تو مرد دانشمند و فرزانہ ہے اور نہ سوار جنگی، پھر کس برتے پر خود کو شاہانہ باتوں کا سزاوار سمجھتا ہے؟ لوگوں نے مجھے (بہرام کو) سلطنت کے لائق سمجھا ہے، لہذا میں تجھے یہاں زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھنے دوں گا۔

خسرو بھی اس کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے، یعنی وہ بہرام پر طعنہ زنی کرتا اور اس کی تلخی و تندی اور خود کو برتر سمجھنے کی خصلت کو ہجو و ذم کا نشانہ بناتا ہے، اس کے مطابق ایک ایسے ظالم و ستمگار دیو نے، جو قوت و طیش کا مجسمہ ہے، اس (بہرام) کو اندھا کر دیا ہے، اسی بنا پر وہ عقل سے ہاتھ دھو بیٹھا، اور کینہ، دشمنی اور خشم کو اپنائے ہوئے ہے، اور یوں شیاطین کے نزدیک لائق تحسین و ستایش ٹھہرا ہے، وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بہرام کو مزید مطعون کرتے ہوئے کہتا ہے، کہ تیرا چراغِ خرد تیری آنکھوں کے سامنے بجھ گیا اور تیرے دل و جان کو نور سے خالی کر گیا ہے، تو بدبخت ستمگار ہے، اپنے برے انجام سے غافل نہ ہو، اور اپنی اس ناپائدار دولت و قوت پر نہ اترا، کیونکہ نہ تو کیکڑے کے پاس عقاب کا پر ہے، اور نہ عقاب آفتاب کے پروں سے اڑ سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں ہر کوئی اپنے اپنے ظرف ہی کے مطابق اپنے کام اور معاملات انجام دیتا ہے۔ فردوسی حکیم و دانشمند تھا، اس کے نزدیک عقل و خرد سے عاری انسان، انسان ہی نہیں اور اس لحاظ سے کسی کو

[1] خلاصۂ شاہنامہ جلد ۱۶، شاہنامہ (نفیسی) ص ۲۴۶۰

بے خرد کہہ دینا گویا بہت بڑی گالی تھی، چنانچہ شاہنامہ میں ہجو و طنز کے تقریباً تمام مقامات پر میں یہ "گالی" نظر آتی ہے، اور بتکرار نظر آتی ہے،

بدو گفت بہرامؑ کای بدنشان — بگفتار و کردار چون بی ہشان
نہ فرزانہ مردی نہ جنگی سوار — ترا با سخنہای شاہان چہ کار
بشاہی مرا خواندند آفرین — شنانم کہ پی بر نہی بر زمین
بدو گفت خسرو کہ "ای بدکنش — چرا گشتہ ای تند و بد ترمنش؟
ستمگارہ دیویست با خشم و زور — کزین گونہ چشم ترا کرد کور
بجای خرد خشم و کین یافتی — ز دیوان ہمی آفرین یافتی
چراغ خرد پیش چشمت بمرد — ز جان و دولت روشنائی ببرد[1]

بہرام پھر اپنی برتری کی ڈینگ مارتا اور اپنے آپ کو سلطنت کے لائق قرار دیتا ہے، جس کے جواب میں خسرو اسے ہجو و طنز کا نشانہ بناتا، اور برا بھلا کہتا ہے، پھر اسکی برائیاں اور کینہ جوئی ایک ایک کرکے گنواتا جاتا ہے، غرض ذم و طنز کا یہ تبادلہ ان دونوں کرداروں میں) بڑی دور تک پھیلتا چلا گیا ہے، چند ایک اشعار ملاحظہ ہوں:

بدو گفت خسرو کہ "ای شوم پی — چہ یاد آمد این گمرہی بدی؟
ندانست کس نامِ تو در جہان — فرومایۂ بودی اندر نہان
بدی را تو اندر جہان مایہ ای — ہم از بی رہان کمترین پایہ ای"
بدو گفت بہرامؑ کز راہ داد — "تو از تخم ساسانی ای بدنژاد"
بدو گفت خسرو کہ "ای بدکنش — نہ از تخم ساسان شدی بدمنش

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۶۶۲، ۶۶۳،

دروغ است گفتار تو سر بسر — سخن گفتن کژ نباشد ہنر
بدین رای و این ہوش و این فرہی — بجوئی ہمی تخت شاہنشہی؟[1]

بہرام چوبینہ فرار ہو کے خاقان چین کے پاس پناہ گزین ہو جاتا ہے، خسرو پرویز اس سلسلے میں خاقان کو خط لکھتا ہے، اس خط میں جہاں اس نے خاقان کو ڈانٹ پلائی ہے وہاں بہرام کو ذم آمیز الفاظ سے خطاب کیا ہے، یہاں بھی فردوسی کی شائستگی اور احتیاط کا رفرما ہے، یعنی بڑی سے بڑی گالی یہ دی گئی ہے کہ بہرام بندۂ ناسپاس ہے خداشناس اور بزرگوں کا مقام شناس نہیں، فرومایہ، بے نام اور بے آرزو ہے۔

بخاقانِ چینی یکی نامہ کرد — تو گفتی کہ از خنجرش خامہ کرد
یکی بندہ بد شاہ را ناسپاس — نہ ہنر شناس و نہ یزدان شناس
یکی خُرد بی نام بی کام بود — پدر بر کشیدش کہ ہنگام بود[2]

مولفِ "راحۃ الصدور و آیۃ السرور" نے مختلف مواقع پر شاہنامۂ فردوسی کے بعض اشعار نقل کیے ہیں، ان میں سے کچھ زمانہ اور جہاں کی ہجو میں ہیں، یہ اشعار شاہنامہ میں مختلف مقامات پر متفرق انداز میں آئے ہیں، لیکن مذکورہ مولف نے انھیں جمع کرکے صرف چند ایک مقامات پر نقل کیا ہے، ملاخطہ ہو۔

زمانہ چنین ست ناسازگار — نترسی ازین چرخِ ناپایدار
بمردی و دانش نیابد گذر — خردمند ازو نیز یابد خطر
دروغ آزمای ست چرخ بلند — گہی شاد دارد گہی مستمند
چنین است کردارِ گردان سپہر — ببرد ز پروردۂ خویش مہر

[1] خلاصۂ شاہنامہ ص ۶۶۲، ۶۶۳، [2] ایضاً ص ۸۵،

چو سرجوئی اش پای یابی نخست — دگر پای جوئی سرش پیشِ تست

بدان ای پسر کین جہان بیوفاست — پُر از رنج و تیمار و درد و بلاست

ہر آنگہ کہ باشی بدو شاد تر — ز رنجِ زمانہ دل آزار تر

جہان شادمانی نماند بجای — بباید شدن زین سپنجی سرای

ہمہ کار گردندہ چرخ این بود — ز پروردۂ خویش پُر کین بود

ستاند ز تو دیگری را دہد — جہان خوانی اش بی گمان بر جہد

تو را از جہان تا توانی مجوی — گلش زہر ناب است خیرہ مبوی[1]

ان کے علاوہ چند اور ہجویہ و طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں جو شاہنامہ کے مختلف مقامات سے منتخب کیے گئے ہیں۔

تو دانی کہ سالار توران سپاہ — نہ پرہیز دارد نہ ترس از گناہ

بویران و آباد نفرین اوست — دل بی گناہان پُر از کینِ اوست

تو دانی کہ او راز بد گوہر است — جہان بد نژاد است و افسونگر است

(خلاصۂ شاہنامہ ص ۲۶۲)

اکوان دیو رستم کے ہاتھوں مارا گیا ہے، اس پر فردوسی گرہ لگا کر ایسے برے انسان کو دیو (شیطان) کہتا ہے، جو خدا کا سپاسگزار نہیں، اور جو مردمی و مروت سے عاری ہے، ایسے شخص کو آدمی کہنا صحیح نہیں،

تو مر دیو را مردم بدشناس — کسی کو ندارد ز یزدان سپاس

ہر آن کو گذشت از رہِ مردمی — ز دیوان شمر مشمرش آدمی

(ایضاً ص ۳۴۲)

افراسیاب کی لڑکی منیژہ کے عاشق بیژن کو گرفتار کر کے افراسیاب کے سامنے

[1] راحۃ الصدور۔ صفحات (مقدمہ) ۲۲، ۲۴ اور ۴۶، ۱۶۲، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۵۶، ۱۳۸، ۱۴۹

لایا گیا ہے، بیژن اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتا ہے، لیکن افراسیاب تلخ اور طنز بھرے لہجے میں اسے کہتا ہے،

تو آنی کز ایران بگرز و کمند — ہمی رزم جستی و نام بلند

کنون چون زنان پیش من بستہ دست — ہمی خواب گوئی بکردار مست؟

بگفتِ دروغ آزمودن ہمی — بجواہی سر از من ربودن ہمی؟

(ایضاً ص ۳۶۰)

بیژن کو کنوئیں میں قید کر دیا گیا ہے، افراسیاب کی غیرت نے برداشت نہیں کیا کہ اس کی لڑکی کسی سے عشق کرے، چنانچہ وہ اپنے ایک آدمی کو حکم دیتا ہے کہ وہ منیژہ کو بھی اسی کنوئیں پر چھوڑ آئے تاکہ یہ بیژن کی غمگساری کرے، اس کے لہجے میں بڑی تلخی اور بھرپور طنز ہے، جو اس کی انتہائی حمیت و غیرت کی غماز ہے۔

داز آنجا بایوانِ آن بی ہنر — منیژہ، کز و ننگ دارد گہر

برو با سواران و تاراج کن — نگون بخت را بی سرو تاج کن

برہنہ کشانش ببر تا بچاہ — کہ در چاہ بین آنکہ دیدی بگاہ

بہارش توئی غمگسارش تو باش — درین تنگ زندان زوارش تو باش

(ایضاً ص ۳۶۰)

مجو از دل عامیان راستی — کہ از جستجوی آیدت کاستی

از ایشان ترا گر بد آید خبر — تو مشنو ز بدگوی دانندہ مغز

بترس از بد مردم بد نہان — کہ بد بہ نہان تنگ دارد جہان

(ایضاً ص ۶۱۳)

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ ادبِ اردو

از عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی، رفیق دارالمصنفین

پیش نظر تاریخ ادب اردو پاکستان کے ممتاز اہل قلم ڈاکٹر جمیل جالبی کی لکھی ہوئی ہے، جو ان کے منصوبے کے مطابق چار جلدوں میں مکمل ہوگی، اس کی پہلی جلد آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک قدیم اردو زبان و ادب کا احاطہ کرتی ہے اور ۷۱۲، صفحات پر مشتمل ہے، یہ جدید انداز کی نہایت مفصل اور مربوط تاریخ ہے۔

پہلی جلد کو ترتیب زمانی کے لحاظ سے چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں، فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی، ادبی اور لسانی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے، پھر بعد کے ابواب میں ممتاز شخصیتوں، شاعروں اور نثر نگاروں کی ادبی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اختتامیہ میں اختصار کے ساتھ روایت کے اتار چڑھاؤ کی داستان بیان کی گئی ہے۔

اردو زبان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ علاقائی بولیوں سے مل کر اس نے کیا کیا شکلیں اختیار کیں اور پھر اس کے بعد اس میں ادبی سرمایہ کا ظہور کس طرح ہوا، یہ ایک طویل داستان ہے، مصنف نے کتاب کی تمہید میں اردو زبان اور اس کے ارتقاء کے اسباب پر بڑی پُر مغز بحث کی ہے۔

جس طرح علاقائی زبانوں کی آمیزش سے اپ بھرنش کی نشو و نما ہوئی، پساچی اپ بھرنش، شورسینی اپ بھرنش، ماگدھی اپ بھرنش، اردھا ماگدھی اپ بھرنش اور مہاراشٹری اپ بھرنش مختلف نام پڑے،

ان اپ بھرنشوں میں شورسینی اپ بھرنش کا حلقۂ اثر سب سے زیادہ وسیع تھا، اسی طرح ملک گیر شورسینی اپ بھرنش کا جدید ترین روپ مصنف کے خیال میں اردو ہے، اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں بہت سے ماہرین لسانیات اور مصنفوں کے بیانات پیش کیے ہیں۔

کتاب کی پہلی فصل شمالی ہند سے تعلق رکھتی ہے، جس میں ۱۰۵۰ء سے ۱۳۲۰ء تک اردو کی نشو و نما اور اس کی بتدریج ترقی دکھلائی گئی ہے، اس سلسلہ میں مصنف کا یہ لکھنا محل نظر ہے کہ "پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ تا امروز اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے، وہ زبان جو غوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہونچی، اس کی ساخت، اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجابی ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا، قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرہ دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجاب کے اثر و رشتہ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ (ص ۳۳)

انھوں نے نہ صرف نواح دہلی کی بولیوں ہریانی اور کھڑی کی قدامت کو نظر انداز کر دیا بلکہ اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ قدیم اردو اور پنجابی میں بنیادی لسانی اختلافات بھی موجود ہیں۔

بہر حال اس نئی بولی کی ابتدا محمود غزنوی کے حملے کے بعد سے ہونے لگی تو سب سے پہلا نام مسعود سعد سلمان کا لیا ہے، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ہندی دیوان بھی مرتب کیا تھا، عوفی نے "لباب الالباب" میں اور امیر خسرو نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" کے دیباچہ میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ دیوان اگر مل جاتا تو بہت سی لسانی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں، ابتدا میں جب اس زبان کا چرچا پھیلا تو فارسی کے بعض شعراء کے ہاں اور بعض فارسی تصانیف میں جو الفاظ اور محاورے راہ پا جاتے ہیں اس کا ذکر کیا گیا ہے، اور سب کے نمونے دئے گئے ہیں۔ . . . .

امیر خسرو کے بعض اشعار کا آدھا مصرع فارسی اور آدھا اردو میں ہے اور ان کے پیر بھائی امیر حسن کی بھی اسی انداز کی ایک غزل پیش کی گئی ہے جس کا ذکر صرف قلمی بیاضوں میں ہے، قلمی بیاضوں سے حوالے تائیدی شواہد کے طور پر تو پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، امیر خسرو کی بہت سی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، انمل وغیرہ جو ان سے منسوب ہیں تحقیق طلب ہیں، مگر ان سے منسوب کتاب "خالق باری" کے بارے میں اختلاف رہا ہے، ایک گروہ اسے امیر خسرو کی تصنیف بتاتا ہے اور دوسرا ضیاء الدین خسرو کی جالبی صاحب نے امیر خسرو کی تصنیف قرار دینے کے جو دلائل دیے ہیں وہ بڑی حد تک قابل وثوق ہیں۔

اس کے بعد بزرگوں کے ملفوظات کا ذکر کیا ہے جو فارسی میں ہیں جن میں عوام کی رعایت سے بعض فقرے یا مصرعے ... اردو میں آ گئے ہیں، انھیں نقل کیا گیا ہے، ان میں وہ فقرے تو مشتبہ ہیں جو بیاضوں سے دیے گئے ہیں، لیکن صوفیہ کے احوال میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے دیے گئے فقرے صحیح ہیں، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے بعض فقرے جو علامہ سید سلیمان ندوی نے دار المصنفین کے مخطوطے جواہر خمسہ اور رسالہ بہاء الدین بن ابراہیم القادری سے اپنی کتاب نقوشِ سلیمانی میں دیے ہیں، مصنف کی نگاہ سے رہ گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات افضل الفوائد سے زیادہ معتبر "فوائد الفواد" ہے، اگر ان سے مثالیں دی جاتیں تو زیادہ بہتر ہوتا، اس میں بھی بہت سے الفاظ آپ کی زبان سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مجموعۂ ملفوظات "خیر المجالس" کو نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ اس میں بھی کئی فقرے ملتے ہیں، شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ پانی پتی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے جملے، دوہے، فانلے اور اشعار کا تو ذکر کیا گیا لیکن مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو نظر انداز کر دیا گیا، ان کے ملفوظات "لطائف اشرفی" میں اردو الفاظ، دعائیں اور اردو و ہندی میں نثر پارے ملتے ہیں، حامد حسن قادری نے "داستان تاریخ اردو" میں نادر کاکوروی کے حوالہ سے ان کے ایک قلمی رسالہ اخلاق و تصوف کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیا ہے اور اس کا ایک اقتباس بھی دیا ہے،

اسی طرح شیخ علاء الدین پنڈوی، شیخ نور الحق پنڈوی، مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ سے بھی بعض الفاظ اور فقرے منقول ہیں، شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے امین الدین کے مکتوبات میں بھی الفاظ، دوہے اور ہنڈولنے ملتے ہیں، لیکن اس کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔

صوفیائے کرام کے علاوہ ہندوؤں میں جو مذہبی تحریکیں اٹھیں ان کے علمبرداروں میں سے کئی نے اس زبان کا سہارا لیا، اس سلسلہ میں نامدیو، سادنا، روی داس، دھوم داس اور ستا کے نام لیے گئے ہیں، کبیر اور گرو نانک کے کلام میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان سے بحث کی گئی ہے۔

بابر سے شاہجہاں تک جتنے اہم شعراء گذرے ہیں ان کا ذکر مع اشعار کے کیا گیا ہے، اس عرصہ میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سرحد کے پیر روشان کی کتاب خیر البیان کو اردو نثر کا واحد نمونہ قرار دیا ہے، اس دور کی سب سے اہم اور قابل قدر تصنیف محمد افضل پانی پتی کی "بکٹ کہانی" جو بارہ ماسہ کی روایت میں لکھی گئی اس پر نہایت دلآویز انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے اور پھر اس کا لسانی تجزیہ بھی کیا گیا ہے،

شاہجہاں کے زمانہ میں جب اس زبان کا رواج بڑھ جاتا ہے تو مصنف نے بتایا ہے کہ شاہی ملازمتوں کے لیے اس سے واقف ہونا ضروری تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

"رقعات عالمگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں حسب ضرورت اس زبان میں خط و کتابت بھی کرتا تھا، شمس اللہ قادری کی اردوئے قدیم میں ہے کہ جس زمانہ میں شجاع اور اورنگ زیب برسر پیکار تھے تو شاہجہاں نے ایک شقہ شجاع کو لکھا، یہ شقہ کسی طرح اورنگ زیب کو مل گیا اور اس کی بنیاد پر اورنگ زیب نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں لکھا تھا کہ "آں فرمانِ عالی

کہ در زبان ہندی از دستخط خاص رقمے فرمودہ شاہد ایں معانی است ۔"

اگر اصل ماخذ کو دیکھ لیا جاتا تو اس میں یہ لفظ نہیں تھا، رقعات عالمگیری مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی جلد اول ص ۲۱۸ پر یہ جملہ اس طرح ہے "از نوشتہ کہ بعبارت ہندی بہ شاہ شجاع قلمی گردیدہ بود" خافی خان کی منتخب اللباب جلد دوم مطبوعہ کلکتہ کے صفحہ ۱۰۳ پر "بخط ہندوی" درج ہے، دونوں کی عبارت سے فارسی رسم الخط کے بجائے ہندوی رسم الخط مراد ہے نہ کہ زبان ۔

پھر آگے چل کر بتایا ہے کہ اردو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جو فارسی کے مقابلہ میں دبی ہوئی تھی نئے رنگ روپ کے ساتھ ابھرنے لگی، اس دور کے لغت نویسوں اور مصنفوں کے ذکر کے بعد "فقہ ہندی" کا نام لیا گیا ہے جس میں فقہی مسائل کو شعر میں بیان کیا گیا ہے، اس کے مصنف کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ مولانا عبد اللہ انصاری ہیں، حالانکہ اس کے مصنف مولانا عبدی ہیں، اس کتاب کے ایک قلمی نسخہ کا تذکرہ علامہ سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں کیا ہے، جو انھیں سفر گجرات میں ملا تھا، اس کا مصنف مولانا عبدی ہی کو بتایا ہے، اس کے خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۱۰۰ھ بعہد اورنگ زیب عالمگیر صاف تحریر ہے ۔

کتاب کی فصل دوم میں گجری ادب اور اس کی روایت سے بحث کی گئی ہے اور یہ دور ۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۰ء تک ہے، پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ گجرات میں عربوں کی آمد کے بعد یہاں مقامی بولی میں عربی الفاظ ملے، پھر سلاطین دہلی کے زیر نگیں آنے کے بعد اس میں فارسی الفاظ شیر و شکر ہو گئے اور حملہ تیمور کی خبر کے بعد شمالی ہند سے لوگ یہاں آئے تو ایک ایسی مشترکہ زبان تیار ہوئی جس نے اظہار میں سہولت پیدا کر دی، اسی زبان کو "گجری" نام دیا جاتا ہے ۔

اس زبان کے نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات، اشعار اور گجراتی بادشاہوں کے بعض بے ساختہ جملوں سے دیے گئے ہیں، اس کے بعد لغت کی جتنی اہم کتابیں لکھی گئیں ان کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے،

مسجدوں اور مزاروں پر کتبے بھی اس زبان میں لکھے گئے، ان کی نشاندہی کی ہے ۔

شاہ وجیہ الدین علوی کے مجموعۂ ملفوظات "بحر الحقائق" قلمی سے فقرے نقل کیے گئے ہیں، یہ مجموعہ مصنف کو کراچی میں ملا، نام کے سلسلہ میں انھیں غلط فہمی ہوئی، وہ اس کو اگر وہ بغور پڑھ لیتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اس کا نام بحر الحقائق نہیں ہے، اس کتاب کا سب سے پہلے حوالہ مولوی عبد الحق کی کتاب "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ملتا ہے، اور تقریباً یہی فقرے انھوں نے بھی نقل کیے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ نام کے سلسلہ میں ان کو بھی غلط فہمی ہوئی، اس مجموعہ کی ایک نقل اتفاق سے میرے پاس بھی ہے جو مجھے حیدر آباد سے ملی، ان میں بھی یہی فقرے موجود ہیں، اس کتاب کی ابتدا یوں ہوتی ہے :

"ایں چند کلمہ از ملفوظ بحر الحقائق و معدن جواہر اسرار الدقائق، مفتاح کنوز معانی، کاشف امور سبحانی، شاہ وجیہ الدین العلوی طاب اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ ۔"

ظاہر ہے مرتب نے یہ الفاظ شاہ وجیہ الدین کے لیے بطور تعظیم کے لکھے ہیں، یہ کتاب کا نام نہیں ہے ۔

نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں بہت سے صوفیہ اور شعراء کی تصانیف کا ذکر کیا ہے، اُن میں شیخ بہاء الدین باجن، قاضی محمود دریائی اور شاہ علی محمد جیو گام دھنی کی تصانیف اور اشعار کی روشنی میں گجری ادبی روایت کا نمائندہ بتایا گیا ہے اور اکبر کی فتح گجرات کے بعد گجری میں لکھنے والے دکن کی قریب ریاستوں میں چلے جاتے ہیں تو گجری روایت کا اثر دکن میں بڑھنے لگتا ہے، اس سلسلہ میں خاص طور سے امین گجراتی کی "مثنوی یوسف زلیخا" پر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے،

فصل سوم میں بہمنی دور کی اردو سے بحث کی گئی ہے، ۱۳۵۰ء سے ۱۵۲۵ء تک میں سیاسی انقلابات سے دکن میں جس طرح اردو کے لیے فضا سازگار ہوئی اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے علاء الدین خلجی کی فتح دیوگیری اور محمد تغلق کے دولت آباد کو پایۂ تخت قرار دینے کے بعد جو بزرگ اس علاقہ میں آئے، یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے اظہار کی مشکل حل ہو گئی،

ان بزرگوں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ میراں صدرہ کی بغاوت کے بعد بہمنی حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے تو یہ زبان اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور دکنی کہلاتی ہے، اس دور کی نمایندہ کتابوں میں فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" پر بڑا مفصل تبصرہ ہے، چونکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کتاب کو مرتب بھی کیا ہے اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے، اس لیے کتاب کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہری ہے۔

اس دور کے اہم مصنفین میں میراں جی شمس العشاق اور اشرف بیابانی کی کتابوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

فصل چہارم میں عادل شاہی دور کا جو ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۵ء تک ہے، تذکرہ کرتے ہوئے عادل شاہی حکمرانوں کی علم پروری اور شعر و شاعری کی سرپرستی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ان کے دور میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا، ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جگت گرو کی کتاب "نورس" اس کے ذوق شعری و موسیقی کی آئینہ دار ہے، اس کتاب کا بڑی گہرائی اور دقتِ نظر کے ساتھ تجزیہ کیا ہے پھر بتایا ہے کہ ملک خشنود کی "جنت سنگار"، مقیمی کی عشقیہ مثنوی "چندر بدن مہیار" صنعتی کی مذہبی مثنوی "قصۂ بے نظیر"، نصرتی کی "گلشن عشق" اور ہاشمی کی مثنوی "قصہ" اور "یوسف زلیخا" اس دور کے شاہکار ہیں، حسن شوقی نے "فتح نامہ نظام شاہ" مرزا مقیم نے "فتح نامہ بکھیری"، نصرتی نے "علی نامہ" میں رزمیہ واقعات لکھے، شوقی نے "میزبانی نامہ" میں بادشاہ کی شادی کا نقشہ پیش کیا، عبدل نے "ابراہیم نامہ" میں عادل شاہ ثانی جگت گرو کو موضوع شعر بنایا، میر مومن نے عشق نامے نجات نامے، مولود نامے معراج نامے، شہادت نامے لکھے، شاہ داول کی طویل نظم "ناری نامہ" بھی اسی دور کی یادگار ہے، ہجویں، مرثیے بھی لکھے گئے، کسی کا تفصیل سے اور کسی کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔

اس دور میں نثر کا موضوع زیادہ تر مذہب اور تصوف رہا، برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقائق" شاہ امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل "گنج مخفی"، "وجودیہ"، "کلمۃ الاسرار"، میراں جی خدا نما کی "شرح تمہیدات ہمدانی" میراں یعقوب کی شمائل الاتقیاء وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، گجری روایت کی

توسیع، ہندی رواج کا عروج بھی زیر بحث آئے ہیں، عبدل کے ابراہیم نامہ کے متعلق خیال ہے کہ یہ مثنوی بیجاپور کی ادبی روایت میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے، پھر ہندی اور فارسی روایت کی کشمکش دکھائی گئی ہے اور ان شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ہاں فارسی طرز ادا اور لہجے کا رنگ بہت نکھر کر سامنے آتا ہے، فارسی مثنویوں کی تقلید میں جو مثنویاں لکھی گئیں جیسے ملک خشنود کی "جنت سنگار" امیر خسرو کی مثنوی "ہشت بہشت" کا چربہ ہے اور دونوں کا نہایت تفصیل سے مقابلہ کرایا گیا ہے ملک خشنود کی مثنوی اور غزلوں کا پہلی مرتبہ اردو تاریخ میں ذکر کیا گیا ہے، نظام شاہی دربار سے وابستہ شاعر حسن شوقی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس نے فارسی غزل کے اسلوب و آہنگ سے متاثر ہو کر اردو شاعری کو ایک خاص شکل دی، اس کی مثنویوں پر تبصرہ میں اس کے شاعرانہ محاسن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، جمیل جالبی صاحب کو اس کی ۳۱ غزلیں بھی دستیاب ہو گئی ہیں، جسے انھوں نے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع کیا ہے۔ حسن شوقی کی غزلوں پر ان کا تبصرہ بڑا دلآ دینہ ہے۔

مذہبی تصانیف پر فارسی کے اثرات کے سلسلے میں شیخ داول، شیخ محمود خوش دہاں، اور شاہ امین الدین اعلیٰ کی تصانیفِ نظم و نثر کا جائزہ لیا گیا ہے، شاہ امین الدین اعلیٰ کی بعض مزید تصانیف کا بھی پتہ چلا ہے، لیکن ان کا ذکر نہیں ہے، شاہ امین الدین اعلیٰ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ریختہ اور غزلیں بھی لکھی ہیں، مثال میں جسے غزل کا عنوان دیا ہے وہ پندرہ[15] اشعار کی ایک نظم ہے جو کتبہ کی شکل میں درگاہ امین الدین اعلیٰ پر ان کے کسی مرید کی لکھی ہوئی ہے، شاہ امین الدین کا سنہ وفات ۱۰۸۶ھ لکھا گیا ہے، حالانکہ درگاہ کے کتبہ سے بڑی کد و کاوش اور دیدہ ریزی سے پڑھنے کے بعد ۲۴ رمضان ۱۰۸۵ھ کی تاریخ ملتی ہے، اس سلسلہ میں اکبر الدین صدیقی کا مقالہ بعنوان "کتبہ امین درگاہ بیجاپور" اردو نامہ کراچی شمارہ ماہ اپریل تا جون ۱۹۶۶ء میں شائع

ہو چکا ہے، غالباً وہ مولف کی نظر سے نہیں گذرا۔

دکنی ادب کے عروج کے سلسلہ میں علی عادل شاہ ثانی تخلص شاہی کی کلیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے؛ اس کے دربار کے ملک الشعراء نصرتی کی تصانیف گلشن عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری پر تفصیلی گفتگو کے بعد "دیوان نصرتی" پر بڑا سیر حاصل تبصرہ ہے، نصرتی کے متعلق خیال ہے کہ اردو کا پہلا قصیدہ نگار ہے، اور قصیدہ میں اس کا نام سودا اور ذوق کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔

نئے عبوری دور کے شعراء میں سید میراں میاں خاں ہاشمی، عبدالمومن مومن، محمد امین ایاغی، مرزا بیجاپوری کے کلام کے نمونے دینے کے بعد لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی فتح بیجاپور کے ساتھ ہی قدیم اردو کا مقامی رنگ اس میں باقی نہ رہا۔

فصل پنجم قطب شاہی دور سے متعلق ہے جو ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۶ء تک ہے اس سلطنت کے بانی سلطان قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اس کے حکمرانوں میں ابراہیم قطب شاہ کے دور میں علم وادب کو خوب ترقی ہوئی، دور اول کے شعراء میں فیروز، محمود اور ملا خیالی کے نام لیے گئے ہیں، اور پھر محمد قلی قطب شاہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسی بادشاہ نے حیدرآباد شہر بسایا، اسی کے زمانہ میں نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں، چارمینار اس کے ذوق تعمیر کا زندہ ثبوت ہے، اسی کے ساتھ وہ نہایت پُرگو اور اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی ہے جس کے دیوان میں پچاس ہزار اشعار ہیں، اس کی شاعری پر طویل تبصرہ کیا گیا ہے، اسی کے دربار میں شیخ احمد گجراتی بار پاتے ہیں، انھوں نے دو مثنویاں "لیلیٰ مجنوں" اور "یوسف زلیخا" لکھیں، آخر الذکر مثنوی کا ایک قلمی نسخہ مصنف کو دستیاب ہو گیا ہے، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے گجری اردو کی ترقی زبان وبیان کا قابل قدر نمونہ بتایا ہے۔

اس کے بعد نثر اور نظم میں فارسی روایت کے عروج پر روشنی ڈالی گئی ہے، پہلا نام ملا اسداللہ وجہی کا آتا ہے، ملا وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اس کی کئی تصانیف یادگار ہیں، نظم میں مثنوی "قطب مشتری" اور نثر میں "سب رس" پر بیس صفحات میں تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ وجہی اردو کی نثر کا موجد ہے۔

فارسی روایت کی توسیع کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے عبداللہ قطب شاہ کی شاعری پر فارسی زبان وتہذیب کے گہرے رنگ کا ذکر کیا گیا ہے، قطب شاہ کے دربار کے ملک الشعراء غواصی کی کلیات کے علاوہ تین مثنویوں "مینا ستونتی"، "سیف الملوک بدیع الجمال" اور "طوطی نامہ" جو شائع ہو چکی ہیں ان کی خصوصیات پورے طور پر دکھلائی گئی ہیں، ابن نشاطی کی "پھول بن" میں صنائع وبدائع اور فن شاعری کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، قطب زاری کی منظوم تحفۃ النصائح، جنیدی کی ماہ پیکر، سید بلاقی کے معراج نامے، عبداللطیف کے وفات نامے، معظم کے معراج نامے اور قلندر نامے پر بھی گفتگو کی گئی ہے، گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے دور میں بتایا گیا ہے کہ کوئی بڑی تصنیف تو نہیں ملتی لیکن اس دور میں جتنی کتابیں نثر ونظم میں لکھی گئیں، ان کے اندر زبان وبیان میں صفائی وروانی پیدا ہو جاتی ہے، اس کے کلام کی خصوصیت پر بحث کرنے کے بعد اس دور کے اہم شاعر طبعی کی مثنوی "بہرام وگل اندام" کا تعارف کرایا گیا ہے، اس دور کے شاعروں میں محب، مختار، فتاحی، شغلی اور ضعیفی کے مذہبی موضوعات پر منظوم رسالوں کے بعد ضعیفی کی "ہدایات الہندی" کو جو فقہ کی کتاب ہے، خاص طور سے اہمیت دی گئی ہے، مذہبی رجحانات کے سلسلہ میں خواصی، سیوک، قدرتی اولیاء کے منظوم قصوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، فائز کی کتاب "رضوان شاہ وروح افزا" کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ فائز اور طبعی کی کتابیں معیار ریختہ سے قریب ہو گئی ہیں، مغلوں کی فتح دکن کے بعد تہذیبی اور لسانی سطح پر تبدیلیاں ہونے لگیں تو نئے ادبی معیار جو سامنے آئے اُن پر کلام کرنے کے بعد حسین ذوقی کی دو مثنویاں "وصال العاشقین" اور "نزہۃ العاشقین"، قاضی محمود بحری کی مثنوی "من لگن" اور "بنگاب نامہ" اور ان کے دواوین کو اسی عبوری دور کا کارنامہ بتایا ہے۔

فصل ششم میں "فارسی روایت کا نیا عروج" کا عنوان دے کر ریختہ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جس کا دور ۱۶۸۵ء سے ۱۷۵۰ء تک ہے، ریختہ کی روایت کے سب سے پہلے اور اہم نمائندہ ولی دکنی

کے نام، خاندان، حالاتِ زندگی، تاریخِ وفات، پر بڑا تحقیقی مواد دیا گیا ہے، کلام اور اس کی خصوصیات پر نہایت دقتِ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے، محاسن کلام کے بیان میں دوسرے شعراء سے موازنہ بھی کیا گیا ہے، اور تقریباً ۲۰ صفحات اس کے لیے وقف کر دیئے گئے ہیں، یہ کتاب کا نہایت اہم اور جاندار حصہ ہے۔

وَلی کے معاصرین اور بعد کی نسل میں سید محمد فراقی، داؤد اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے نام لیے گئے ہیں، سراج کے متعلق مصنف نے بتایا ہے کہ وَلی کے بعد اور میر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصہ کے سب سے بڑے شاعر ہیں، ان کے کلام سے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ یہ آواز اردو شاعری میں پہلی بار سنی جا رہی ہے، سراج کے کلام پر تبصرہ بھی بڑا دلکش اور دلآویز ہے۔

وَلی کے بعد کی نسل میں شاہ قاسم علی قاسم، عارف الدین خاں عاجز اور لچھمی نرائن شفیق کا ذکر کرنے کے بعد یہ فصل ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد اختتامیہ ہے، پھر ضمیمے شامل کئے گئے ہیں جن میں پاکستان کے علاقوں میں اردو کا ارتقاء دکھلایا گیا ہے، لیکن ان ضمیموں کو پڑھ کر قاری عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے، پنجاب میں اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ " اردو کا مولد پنجاب ہے" (ص ۶۰۲) اور جب سندھ کا ذکر آتا ہے تو لکھا جاتا ہے کہ "یہ زبان اپنی ابتدائی شکل میں سندھ و ملتان کے علاقہ میں عربوں کے زیر اثر بننی شروع ہوئی" (ص ۶۰۳) اسی طرح صوبۂ سرحد کے متعلق ہے کہ " اردو کی جنم بھومی درحقیقت سرحد کا کوہستانی خطہ ہے" (ص ۶۹۹) پھر جب بلوچستان پر لکھا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ " اردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی" (ص ۷۱۱) پھر آخر میں ہر علاقہ کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اس زبان کا مولد ہر وہ علاقہ ہے جہاں مختلف زبان کے لوگ آپس میں مل جل رہے ہیں" یہ تحقیقی انداز نہیں، مورخ کو حقائق کی روشنی میں فیصلہ کن بات کہنی چاہیئے، پھر بھی مصنف کے خیالات سے بعض مقامات پر اتفاق نہ ہو یا نہ ہو لیکن اپنے تحقیقی مواد، طریق فکر، اسلوب تحریر کے اعتبار سے یہ گراں قدر تصنیف ہے، سرکاری مقرر فیتوں کے باوجود مصنف نے تن تنہا اتنی اہم کتاب لکھی، جو لائق ستائش ہے، یہ ہندوستان میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوئی ہے میں مل سکتی ہے

مطبوعات جدیدہ

حدیث کا درایتی معیار: مرتبہ مولانا حافظ محمد تقی امینی صاحب تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۸۴، قیمت مجلد ۲۳ روپے، غیر مجلد ۲۰ روپے۔ پتے: ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد دہلی (۲) ادارہ علم و عرفان، امینی منزل، دودھ پور روڈ، علی گڑھ۔

محدثین نے صحیح و موضوع اور قوی و ضعیف حدیثوں میں امتیاز کے لیے روایت ہی کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کئے ہیں، لیکن اصول روایت کے مقابلہ میں اصولِ درایت پر کم توجہ کی گئی ہے، متقدمین میں حافظ ابن جوزیؒ کا نام اس حیثیت سے زیادہ ممتاز ہے، اردو میں روایت کے اصول و ضوابط پر متعدد رسالے لکھے گئے ہیں، مگر درایت کے سلسلہ میں قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے، اس لیے مولانا محمد تقی امینی ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے محنت، مطالعہ اور کافی غور و فکر کے بعد اس موضوع پر یہ مبسوط کتاب لکھی ہے، اس میں حدیث کا درایتی معیار بیان کرنے سے پہلے سرچشمۂ حدیث یعنی ذات نبویؐ پر مختلف حیثیتوں سے مفید اور عالمانہ بحثیں کی گئی ہیں، جن سے نبوت و رسالت کی حقیقت اور نبی و رسول کی عظمت اچھی طرح واضح ہو گئی ہے، مولانا نے شعور نبوت پر جو گفتگو کی ہے وہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، اس میں اس علم و ادراک، فہم و بصیرت اور حکمت و نورانیت کی تشریح کی ہے، جو نبی کو من جانب اللہ عطا ہوتی ہے، خدا اور نبی کے درمیان رابطہ کا کام فرشتے انجام دیتے ہیں، اس لیے سفارت کے عنوان سے ان کا بھی مختصر ذکر آگیا ہے۔ فہم حدیث کی طویل بحث میں امور دین سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کو وحی الٰہی سے مستنبط بتایا ہے اور دوسروں کے مقابلہ میں آپؐ کے استنباط کی فوقیت و برتری بھی ثابت کی ہے، پھر جوہر انسانیت کے تربیتی پروگرام کا مختصر

دیا ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے کلیات پر غور کرکے مرتب کیا تھا، لائق مصنف نے نبوت کے منصب پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم وفہم اور حکمت وشعور کی مفصل تشریح اس لیے کی ہے کہ سرچشمۂ نبوت کے فیضان (حدیث) کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت سامنے آجائے، یہ اس کے متن پر نقد وبحث کی بنیاد بن سکے، کتاب کے شروع میں درایت کا مفہوم بیان کیا ہے اور آخر میں قرآن وحدیث اور اقوالِ صحابہؓ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کیا ہے، اس سلسلہ میں محدثین کی کوششوں کا اجمالی جائزہ بھی لیا ہے، اصول روایت میں حدیث کی سند یعنی راوی کے حالات کی چھان بین کرکے اس کی بیان کردہ حدیث کا درجہ ومرتبہ متعین کیا جاتا ہے، اور اصول درایت میں اس کے متن ومضمون پر نقد وجرح کرکے اس کی توثیق یا تضعیف کی جاتی ہے، مصنف نے اول الذکر کے لیے خارجی نقد حدیث اور موخر الذکر کے لیے داخلی نقد حدیث کی اصطلاح وضع کی ہے، ان کا مقصد داخلی نقد حدیث کی وضاحت وتشریح ہے، مگر اس کے ضمن میں خارجی نقد حدیث کے بعض اصول بھی قلمبند ہوگئے ہیں، کیونکہ وہ بھی داخلی نقد حدیث کے ساتھ خاص ہیں، یا خارجی اور داخلی دونوں میں مشترک ہیں، ان دونوں کے ٹکراؤ کی بعض صورتیں بیان کرکے ان میں تطبیق بھی دی ہے، اور بتایا ہے کہ عدم تطبیق کے وقت داخلی کو خارجی پر ترجیح ہوگی، مصنف کے بعض خیالات پر ممکن ہے ظاہر بیں لوگوں کو اعتراض ہو، مگر غور وفکر کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی، مثلاً ان کا خیال ہے کہ مستند کتب کی ثقہ راویوں سے منقول روایتیں شانِ نبوت کے منافی ہونے کی صورت میں قابل قبول نہ ہوں گی، اسی طرح وہ نسخ کو قرآن مجید کے بجائے قدیم آسمانی کتابوں کے ساتھ مخصوص بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قرآن کے کسی حکم میں رد وبدل کا تعلق ذات سے نہیں ہوتا بلکہ صرف اوصاف سے ہوتا ہے، اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کی نوعیت وحکمت لوگوں پر واضح نہیں ہوسکی اور تجدد پسند حضرات انھیں قرآن کے احکام میں رد وبدل پر محمول کرکے خود بھی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور دوسروں کو بھی کیا، مصنف کا خاص موضوع فقہ واجتہاد ہے، اس پر ان کی جو متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے موجودہ دور میں فقہ

واجتہاد کی راہ ہموار ہوتی ہے، یہ کتاب فن حدیث سے ان کی دلچسپی کا نتیجہ ہے، اس کا مقصد حدیث کی معرفت ودرایت کے قدیم اصول وضوابط کی تشریح اور اس کے نئے قواعد وقوانین مرتب کرنے کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔

البیرونی اور جغرافیۂ عالم :۔ مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲، مجلد قیمت ۱۲ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ابوریحان البیرونی دسویں صدی عیسوی کا نامور فاضل ومحقق اور علم الاقوام خصوصاً ہندوستانی علوم ومذاہب کا ماہر تھا، اس نے بڑی ہمہ گیر طبیعت پائی تھی اور اسے ہر قسم کے علوم ومعارف سے دلچسپی تھی اور سب میں اس کی جدت وجودت اور تحقیق وانکشاف کے آثار ونتائج ملتے ہیں، لیکن اس کے باوجود لوگ عرصۂ دراز تک اس کے علمی کمالات سے ناواقف رہے، زمانۂ حال کے ایک ترکی فاضل زکی ولیدی توغان استاذ شعبۂ تاریخ استنبول یونیورسٹی نے البیرونی کے علمی کارناموں پر مفید تحقیقات کی ہیں، ان کی تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ صفة المعمورہ علی البیرونی کی اشاعت ہے، اس میں پروفیسر توغان نے البیرونی کی چار کتابوں (۱) قانون مسعودی (۲) تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن (۳) کتاب الجماہر فی معرفۃ الجواہر (۴) کتاب الصیدنہ کے منتخب حصے یکجا کرکے اس کے جغرافیائی کمالات نمایاں کیے ہیں، ہندوستان کے اہل علم میں جناب سید حسن برنی مرحوم کو بھی البیرونی کی زندگی اور علمی کمالات سے بڑا شغف تھا، ترکی فاضل کی تصنیف شائع ہوئی تو انھوں نے جون ۱۹۴۲ء کے معارف میں اس پر عالمانہ تبصرہ لکھا، یہی کتاب مولانا آزاد مرحوم کی نظر سے گذری تو انھوں نے بھی البیرونی اور جغرافیۂ عالم کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور اس میں البیرونی کے علم جغرافیہ میں بعض اولیات اور اہم کارناموں کی جانب توجہ دلائی، مقالہ کی تحریر کے وقت صفة المعمورہ کے علاوہ البیرونی کی بعض دوسری کتابیں بھی مولانا کے پیش نظر تھیں، انھوں نے اس کے جغرافیہ سے دلچسپی اور القانون کے اہم جغرافیائی

مباحث پر روشنی ڈالنے کے علاوہ القانون کے یورپ، آکسفورڈ اور ہندوستان کے بعض قلمی نسخوں کے متعلق ضروری معلومات بھی تحریر کیے ہیں اور پروفیسر توغان کی کوششوں کی تحسین بھی کی ہے، اب جناب مسیح الحسن صاحب نے آزاد بھون کی لائبریری سے مولانا کے اس غیر مطبوعہ مقالہ کی نقل حاصل کرکے اسے شائع کیا ہے، شروع میں ان کے قلم سے اس کے متعلق بعض وضاحتیں بھی درج ہیں اور یہ جناب ضیاء الحسن فاروقی کے مقدمہ و حواشی سے بھی مزین ہے، مقدمہ میں البیرونی کے حالات و کمالات خاص والہانہ انداز سے لکھے گئے ہیں، اکثر لوگوں کو مولانا کی اس تحریر کا علم نہ ہوگا، اس علمی تبرک کو شائع کرنے والے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحدید نسل اور اسلامی تعلیمات: مرتبہ مولوی عبید اللہ الاسعدی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپیے، پتہ: اسلامک بک سنٹر مکارم نگر، لکھنؤ۔

تحدید نسل اور ضبط تولید کی حمایت و مخالفت میں بہت لکھا گیا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں تحدید نسل کی موجودہ کوششوں اور رائج و عام صورتوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے باطل قرار دیا گیا ہے، شروع میں عالم کی تخلیق و بقاء کے طبعی نظام اور مخلوق کی رزق رسانی کے قدرتی انتظام کو بیان کرکے تحدید نسل اور بڑھتی ہوئی آبادی کی روک تھام کی ضرورت کے جو اسباب بتائے جاتے ہیں اُن کا جواب دیا ہے، اور افزائش نسل اور توالد و تناسل کو منشائے قدرت بتایا ہے، مصنف نے نکاح کو افزائشِ نسل کی صحیح صورت قرار دینے کے بعد اس کی ضرورت، مصلحت اور شرعی اہمیت واضح کی ہے، آخر میں ضبط نسل کی صورتوں، قتل اولاد، اسقاط، نسبندی، اختصاء اور عزل کے متعلق احکامِ شریعت بیان کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں قرآن و حدیث کے نصوص کے علاوہ علمائے اسلام کے اقوال بھی پیش کیے ہیں، کتاب کی ترتیب سلیقہ سے کی گئی ہے اور اس سے زیر بحث مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

"ض"

جلد ۱۲۷ ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات